تراجم

علمای سلف

یعنی گزشتہ علمائے اسلام کے حالات میں وہ تاریخی رسالہ

جسکو

جناب مولوی محمد حبیب الرحمن خانصاحب شروانی رئیس بھیکن پور ضلع علی گڑھ

نے

ندوۃ العلماء کے چوتھے سالانہ جلسے میں بمقام میرٹھ پیش کیا

رشید احمد کے اہتمام سے مطبع احمدی علیگڈہ میں طبع ہوئی
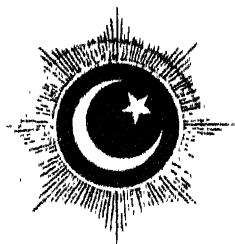
(احمدی پریس علی گڈہ سے شائع ہوئی)

فہرست مضامین رسالہ علمائے سلف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ کہ رسالہ ہذا دوبارہ چھپتا ہی۔ پہلے مطبوعہ نسخے عرصہ ہوا ختم ہو چکے
ارباب شوق کا تقاضا باقی ہی۔ علماے سلف کو قدیم و جدید دونوں خیال
کے سرگروہوں نے اسناد قبول بخشیں۔ ایک بابو صاحب نے انگریزی
ترجمہ کی اجازت حاصل کی۔ رسالے پر نظر ثانی ہوئی ہی بعض مضامین کا
اضافہ ہوا ہی عبارت میں بھی تصرف کیا گیا ہی۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

حبیب گنج
سنہ ۱۳۲۷ھ

محمد حبیب الرحمن خاں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامدًا و مصلیًا

خزاں رسید و گلستاں آب جمال نماند　　سماع بلبل شوریدہ رفت و حال نماند

نشان لالہ ایں باغ از کہ می پرسی　　برو کہ انچہ تو دیدی بجز خیال نماند

شوال ۱۳۱۱ھ کا ذکر ہو کہ ندوۃ العلما کا اول جلاس شہر کانپور میں منعقد ہوا تھا جس میں دیارہند کے اکثر مشاہیر علما رونق افزا تھے۔ بزم اُن کے جمال کمال سے روشن تھی اور نگاہ اُن کے کمال جمال سے منور۔ اور ایک ایسا پاکیزہ منظر پیش نظر تھا جو تاریخ ہندوستان میں اپنی آپ ہی نظیر تھا۔ میری آنکھیں جب اُن نورانی شکلوں کے دیدار سے فیضیاب ہوئیں تو چشم بصیرت میں ایک نور پیدا ہوا جس کی روشنی میں وہ زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا جو فضائے عالم میں صدہا برس کی راہ طے کرچکا ہی یعنی متاخرین کا مجمع دیکھکر متقدمین کا تصور بندہا اور اُن کے حالات کے مطالعے کا شوق دل میں پیدا ہوا۔ یہ شوق ہنوز دل میں قائم تھا کہ جناب مولانا سیّد محمد علی صاحب ناظم ندوہ نے ایک نقشۂ مضامین شائع فرمایا جس میں چند عنوان اس غرض سے درج تھے کہ آیندہ جلسۂ ندوہ کے لیئے انپر مضامین لکھے جائیں۔ اتفاقاً اُن میں ایک عنوان علمائے سلف بھی تھا اس نقشے کو دیکھکر پہلی تحریک میں ایک تازہ جوش پیدا ہوا اور باوجود بے مائگی یہ سوچ کر کہ اس ذریعے سے چندے ان بزرگوں کی بھی معنوی ہمنشینی نصیب ہوجائیگی عنوان بالا کو میں نے لے لیا ؎

گرچہ از نیکاں نیم خود را بہ نیکاں بستہ ام　　در ریاض آفرینش رشتۂ گلدستہ ام

اس رسالے کی تیاری کے واسطے حسب ذیل کتابیں میں نے لفظ بہ لفظ پڑھیں اور انمیں سے

حالات انتخاب کیے۔ تذکرۃ الحفاظ از امام شمس الدین ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ (کشف الظنون) مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن۔ وفیات الاعیان فی انباء ابناء الزمان از قاضی القضاۃ ابی العباس احمد ابن خلکان المتوفی ۶۸۱ھ مطبوعہ مطبع میمنیہ مصر ۱۳۱۰ھ نزہۃ الالباء فی طبقات الادباء از امام ابی البرکات عبدالرحمن ابن محمد انباری المتوفی ۵۷۷ھ ہجری (کشف الظنون) مطبوعہ مصر ۱۲۹۴ھ عیون الانباء فی طبقات الاطباء از طبیب عالم موفق الدین ابو العباس احمد ابن قاسم المعروف بابن ابی اصیبعہ المتوفی ۶۶۸ھ مطبوعہ مطبع وہبیہ مصر ۱۲۹۹ھ الشقائق النعمانیہ فی علماء الدولۃ العثمانیہ از مولا طاشکبری زادہ رومی المتوفی ۹۶۸ھ (العقد المنظوم) مطبوعہ مطبع میمنیہ مصر ۱۳۱۰ھ العقد المنظوم فی ذکر افاضل الروم مطبوعہ مطبع بالا۔ ان کتابوں کے علاوہ جستہ جستہ ذیل کی کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔

مقدمہ فتح الباری للامام ابن الحجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ (کشف الظنون) مطبوعہ مطبع انصاری دہلی ۱۳۰۲ھ۔ الخیرات الحسان فی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفۃ النعمان للمفتی احمد بن الحجر المکی المتوفی ۹۷۳ھ مطبوعہ مطبع میمنیہ مصر ۱۳۱۱ھ۔ الرحمۃ الغیثیہ بالترجمۃ اللیثیہ للحافظ ابن حجر العسقلانی مطبوعہ مطبع میریہ ۱۳۰۱ھ۔ رحلۃ ابو عبداللہ محمد ابن عبداللہ المعروف بابن بطوطہ مطبوعہ مطبع وادی النیل مصر ۱۲۸۷ھ۔ کامل از علامہ ابن اثیر جزری المتوفی ۶۳۰ھ (ابن خلکان) مطبوعہ مطبع ذات التحریر مصر ۱۳۰۳ھ۔ الملل والنحل از عبدالکریم شہرستانی مطبوعہ ۱۲۸۸ھ۔ بستان المحدثین از شاہ عبدالعزیز صاحب مرحوم مطبوعہ مطبع منشی محمد منیر ۱۲۷۵ھ۔ صناجۃ الطرب فی تقدمات العرب از نوفل آفندی مطبوعہ مطبع امیرکان بیروت۔ کشف الاسرار شرح اصول فخر الاسلام بزدوی از امام عبدالعزیز بخاری

عہ ابن بطوطہ کی سیاحت کا آغاز ۷۲۵ھ میں ہوا اور اختتام ۷۵۶ھ میں۔

المتوفی سنہ ۳۰۷ھ مطبوعہ مطبع صحافیہ عثمانیہ قسطنطنیہ سنہ ۱۳۰۸ھ۔ اس فہرست کے پیش کرنے سے اپنا بلاغ نظر جتانا مقصود نہیں بلکہ یہ اظہار مطلوب ہی کہ یہ کتاب کس قسم کے مادے سے صورت پذیر ہوئی ہی۔ اس موقع پر اتنی گزارش کی اور جسارت کیجاتی ہی کہ اس ناچیز تحریر میں جو بحث حالات و واقعات سے کی گئی ہی یا جو نتیجہ اُن سے نکالا گیا ہی وہ مؤرخانہ حیثیت سے ہی نہ مفتیانہ یا متکلمانہ حیثیت سے اور اُس سے مقصود گزشتہ علمائے اہل اسلام کے حالات کا لکھنا ہی نہ کسی دینی مسالے کا فیصل اور طے کرنا۔ حوالۂ واقعات لکھتے وقت حسب ذیل علامتوں سے کام لیا گیا ہی

تذ۔ تذکرۃ الحفاظ۔ ابن۔ ابن خلکان۔ شق۔ شقائق نعمانیہ۔ عیون۔ عیون الانبار۔ نزہتہ۔ نزہتہ الالبار۔ مقدمہ۔ مقدمۂ فتح الباری۔ ج۔ جلد۔ ص۔ صفحہ۔

شقائق نعمانیہ کی تقسیم جلدوں پر اُس کے مصنف نے نہیں کی ہی۔ مگر چونکہ یہ کتاب تاریخ ابن خلکان کی دونوں جلدوں کے حاشیے پر درج ہی اور دونوں جلدوں کے صفحوں کا شمار جُدا جُدا ہی اس لیے حاشیے کی کتاب کی بھی تقسیم کرنی پڑی۔

ہر واقعے کا حوالہ بقید جلد و صفحہ کتاب اس کتاب کے ہر صفحے کے نیچے لکھدیا گیا ہی اور اس طرح میں نے اپنا وہ فرض ادا کر دیا ہی جو بحیثیت ناقل میرے ذمے تھا۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

خادم طلبا

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی

بھیکن پور ضلع علی گڑھ

۱۹۔ رمضان المبارک سنہ ۱۳۱۴ھ

عنوانِ اوّل

طلبِ علم

علمائے سلف کے جن حالات سے ہم بحث کرنا چاہتے ہیں ان میں طلب علم کو سب سے اول ہم نے قائم کیا ہی اہل علم کی زندگی کے مختلف مدارج ہیں۔ یہ منزل سب سے پہلی ہی اور یہ تقدم نہ صرف بہ لحاظ زمانے کے ہی بلکہ باعتبار اہمیّت اور شان کے بھی۔ کیونکہ یہی منزل ہی جو اس بات کا فیصلہ کردیتی ہی کہ کون منزل مقصود تک پہنچیگا اور کون حرماں نصیب ہوگا۔ ایک عالم کا ذکر آپ آگے پڑہیں گے کہ ایک شب اپنے دو طالب علموں کو انھوں نے دیکھا کہ ایک تکیے کا سہارا لیے کتاب دیکھ رہا تھا دوسرا دوزانوں مستعد بیٹھا مطالعے میں مشغول تھا اور وقتاً فوقتاً کچھ لکھتا بھی جاتا تھا۔ جوہر شناس اُستاد نے یہ ماجرا دیکھکر اول کی نسبت کہا کہ اِنَّهُ لَا يَبْلُغُ دَرَجَةَ الْفَضْلِ[1] دوسرے کی بابت فرمایا کہ سَيُحَصِّلُ الْفَضْلَ وَيَكُونُ لَهُ شَانٌ فِي الْعِلْمِ[2]۔ تجربے نے ثابت کیا کہ یہ پیشین گوئی بالکل سچّی تھی۔ پس جو منزل اس طرح آیندہ زندگی کا فیصلہ کردینے والی ہو اُس کے مہتم بالشان ہونے میں کس کو کلام ہوسکتا ہی۔ اس منزل کو اگر صرف اول منزل کہکر چھوڑ دیا جائے تو ایک پہلو اُس کا بیان ہوگا جسطرح یہ منزل سب سے اول ہی اُسی طرح سب سے آخر ہی بلکہ یہ کہنا قطعاً مبالغے سے مبرا ہی کہ باکمال علما کی زندگی میں اول سے آخر تک یہ منزل ختم نہیں ہوتی۔ آپ آگے کے صفحوں میں بہت سے

---

[1] اس کو فضیلت کا رتبہ حاصل نہوگا۔ [2] یہ شاندار فاضل ہوگا۔

واقعے اس دعوے کی تائید میں پائیں گے۔ اہل کمال نوّے برس کی عمر میں بھی طالب علم تھے
اور جب اُن کی روح سکرات کے تلاطم میں تھے اُن کا دل و دماغ خدمت علم میں مصروف تھا

مہرِ تو در وجودم و عشقِ تو در سرم ۔۔۔ با شیر اندروں شد و با جاں بدر شود

شیخ الاسلام انصاری نے فرمایا ہی کہ هٰذا الشانُ شانُ مَنْ لَیْسَ لَہٗ شانٌ سِوٰی
هٰذا الشانِ یعنی طلب علم اُن جوانمردوں کا کام ہی جن کو یہی دُھن ہو۔ طالب علمی کے
مختلف دَور ہیں۔ پہلا دور مکتب یا مدرسے میں اُستاد کی زیر نگرانی ختم ہوتا ہی اور فی الواقع
اُسکو بنیاد کمال سے زیادہ کوئی لقب نہیں دیا جاسکتا۔ اگر کوئی شخص ایک عالیشان عمارت
کا منصوبہ دماغ میں قائم کرے اور اُس کی بنیاد بھر کر سطح زمین سے کچھ بلند کردے اور اتنی
محنت کے بعد وہ یہ خیال کرے کہ میں مکان بناچکا تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ عالیشان
عمارت بن چکی۔ چند روز میں ہوا اور بارش کے صدمے اتنی بنیاد کو بھی نسیا منسیا کردینگے
اور اس کے بانی کی پست ہمتی کی ایک عبرتناک یادگار قائم رہ جائیگی۔ بجنسہٖ یہی حال اُن
ہونہار طالب علموں کا ہی جو مدرسہ چھوڑ کر یہ سمجھ لیں کہ ہم عالم بن چکے۔ یہ طلبہ بھی اپنی ہونہاری
کا خون کرکے اپنے اُستاد اور دوستوں کے دلوں کو حسرت کا داغ دینگے۔ دوسرا دَور
طالب علمی کا مدرسے کے بعد شروع ہوتا ہی جس میں انسان خود شاگرد بنتا ہی اور خود اُستاد [۱]

معلّم کیست عشق و کنجِ خاموشی دبستانش ۔۔۔ سبق نادانی و دانا دلم طفلِ سبق خوانش
زہر کس نا یداین اُستاد شاگردی نہ ہر کوہے ۔۔۔ بدخشاں باشد و ہر سنگریزہ لعلِ رخشانش

اس دَور کی انتہا وہ ہی جو بلند خیال ابن العلا نے مقرر کی ہی یعنی مادامتِ الحیوٰۃ
تحسن بہ یہی دَور کمال کا دَور ہی۔ پس طالب علمی اور کمال گویا ایک ہی ہیں اور اسی لحاظ سے

[۱] جب تک زندگی بخیر رہے ۱۲

ہم نے طلب علم کو اول اور آخر منزل قرار دیا ہے۔

جن جوان مردوں نے میدان طلب علم کو طے کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ راہ کیسی معرکہ خیز اور صبر آزما ہے۔ کہیں افلاس کا مردم خوار دیو اپنی منحوس صورت دکھلاتا ہے اور قوت لایموت کے حاصل ہونے کی بھی کوئی شکل نظر نہیں آتی کبھی جڑی بوٹی کے پتوں پر بسر کرنی ہوتی ہے۔ اور کبھی نانبائی کی دکان پر صرف بوئے طعام پر قانع ہونا پڑتا ہے۔ کہیں محنت و مشقت سے دل گھبراتا ہے اور چھکے چھوٹتے ہیں۔ کسی کو ناز و نعمت کے کرشمے اپنی طرف کھینچتے ہیں کسی کی نفسانی خواہشیں دست بگریباں ہوتی ہیں۔ غرض ایک ہنگامہ بلاخیز سے سامنا کرنا پڑتا ہے جن ارادوں میں ذرا بھی قوت کی کمی ہوتی ہے وہ ان معرکوں کے مقابلے میں پست ہو جاتے ہیں اور ان کی زبان حال پر لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ کا مضمون ہوتا ہے لیکن سچی طلب اپنا راستہ صاف کر کے طالب کو مطلوب تک پہنچا دیتی ہے جس قدر دقت اور صعوبت پیش آتی ہے ان بہادر طالبوں کے عزم زیادہ مستحکم اور حوصلے زیادہ بلند ہوتے جاتے ہیں۔ اگر حوصلوں میں وسعت اور ارادوں میں استحکام نہوتا تو اہل اسلام کو شیخ الاسلام بقی بن مخلد امام بخاری اور حکیم ابو نصر فارابی نصیب نہوتے۔ کیا چقندر کے پتے اور جنگل کی گھاس کھا کر اور شب کو پاسبانوں کی لالٹینوں سے مطالعہ کر کے امام اور حکیم بنجانا آسان ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ کون سی قوت تھی جس نے علی بن عاصم عراقی اور ابن سنجر کو ناز و نعمت کے آغوش سے چھین کر راہ طلب میں سرگرداں کر دیا اور اتنا پھرایا کہ ایک کو مُسند عراق اور دوسرے کو حافظ کبیر بنا کر چھوڑا۔ بیشک یہ طلب صادق ہی کا کرشمہ تھا۔ اتنی تمہید بہ امر ناظرین باتمکین کے ذہن نشین کر سکیگی کہ ہم علمائے سلف کی طلب علم کی نسبت کس کس پہلو پر بحث کرنے والے ہیں۔ اور سچی طلب کا معیار ہمارے پاس کیا ہے۔

افلاس انسان کا حوصلہ پست کرنیوالی اور ہمت کی کمر توڑ دینے والی دنیا میں کوئی چیز

غالباً افلاس سے بڑھ کر نہیں ہے مفلسی میں پھنسکر آدمی عزم کا استحکام اور ارادے کی استواری بالکل کھو بیٹھتا ہے۔ اور دل و دماغ کی شگفتگی جو تمام بلند خیالیوں کا سرچشمہ ہے قطعاً معدوم ہو جاتی ہے۔ اگر ایک سرسبز چمن کی سیرابی کے سارے ذرائع مسدود کر دیے جائیں تو وہ مایہ بہجت سراپا وحشت بن جائیگا۔ اور ظاہر ہے کہ جس چمن کے نشوونما یافتہ گلبن جل کر ہیزم خشک ہو جائیں اس میں تازہ نو یادوں کے اُگنے کی کیا امید ہو سکتی ہے بعینہٖ یہی مصیبت افلاس کے ہاتوں انسانی دل و دماغ پر نازل ہوتی ہے۔ مفلسی نہ صرف موجودہ خیالات کا ستیاناس کرتی ہے۔ بلکہ آیندہ حوصلوں اور امنگوں کا پیدا ہونا بھی بند کر دیتی ہے ؎

انچہ شیراں را کند روبہ مزاج — احتیاج است احتیاج است احتیاج

خدا جانے کتنی قابلیتوں کا خون اس مردم خوار دیو کی گردن پر ہے اور کس قدر استعدادیں اس بیدرد کے ہاتوں ضائع ہوئی ہیں۔ جو بلند ہمت نوجوان اپنے بڑھتے ہوئے ارادوں میں افلاس کے پھندے میں پھنسکر مایوسی کے ساتھ بدست و پا رہ جاتے ہیں اُن کی مثال بجنسہ ایسی ہے کہ ایک سیاہ ہرن اپنی طاقت اور قوت کے زعم میں اکڑا چلا جا رہا ہے میدان کی وُسعت اُس کے دل میں اُمنگیں پیدا کر رہی ہے اور قدم قدم پر اُس کی چال بڑھتی جاتی ہے ناگاہ وہ صیاد کے مضبوط پھندوں میں (جو دُور تک پھیلے ہوئے ہیں) پھنسکر گر پڑا۔ اب وہ جسقدر اپنی قوت صرف کرتا ہے اُتنی ہی اُن پھندوں کی گرفت سخت ہوتی جاتی ہے جن لوگوں نے یہ منظر ملاحظہ کیا ہے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ جنگل کا آزاد منش پہلوان کیسا اُن پھندوں میں پڑکر اپنی چوکڑی بھول جاتا ہے۔ آہ اے افلاس! تو آج تو مسلمانوں کے حوصلوں پر ہمیشہ سے زیادہ بیداد کر رہا ہے۔ جس قوم میں حوصلوں کا قحط اور ہمت کا کال ہو۔ اسمیں اگر کچھ الوالعزم جویائے کمال نکل آئیں تو اُن کو تو پیسکر رکھدے۔ ہائے یہ کیسا ظلم ہے۔ لیکن تجھ کو یاد ہوگا کہ تیرا زور

آج کل کی طرح ہمیشہ ہماری ہمتوں پر غالب نہیں رہا۔

کیا تجھ کو یاد نہیں ہے کہ جب حافظ الحدیث حجّاج بغدادی شبابہ کے یہاں تحصیل علم کو جانے لگے تو اُن کی مقدرت کی کل کائنات یہ تھی کہ اُن کی دلسوز والدہ نے سو ٹکیے پکا دیے تھے جنکو وہ ایک گھڑے میں بھر کر ساتھ لے گئے۔ روٹیاں مہربان ماں نے پکا دی تھیں سالن ہونہار اور دلیر فرزند نے خود تجویز کر لیا اور اتنا کثیر و لطیف کہ آج تک صدہا برس گزرنے کے بعد بھی ویسا ہی تر و تازہ موجود ہے وہ کیا ؟ دجلے کا پانی۔ حجّاج ہر روز ایک روٹی دجلے کے پانی میں بھگو کر کھا لیتے اور اُستاد سے پڑہتے جس روز وہ روٹیاں ختم ہوگئیں انکو استاد کا فیض بخش دروازہ چھوڑنا پڑا[1]۔ شیخ الاسلام بقی بن مخلد اس سے بھی زیادہ مؤثر حکایت بیان کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جس پر ایام طالب علمی میں اتنا سخت زمانہ گزرا تھا کہ بے مائیگی کی وجہ سے چقندر کے پتے کھا کھا کر بسر کرتا[2]۔ پتے کھانا کچھ زیادہ عجیب بات نہیں۔ بھوک وہ بلا ہے کہ لخت جگر بچوں کے کباب ماں باپ کو کھلا کر چھوڑتی ہے۔ قابل تحسین و ہزار آفریں یہ امر ہے کہ جب افلاس نے چقندر کے پتے کھانے پر مجبور کیا اُس میں اتنی قوت نہ تھی کہ علمی شوق پر غالب آتا اور اُس دلیر طالب علم کی ہمت توڑ دیتا۔ یاد ش بخیر امام بخاری کو ایام طالب علمی میں ایک سفر میں تہیدستی نے اتنا مجبور کیا کہ تین دن برابر اُنھوں نے جنگل کی بوٹیاں کھائیں[3]۔ ابن المقری۔ ابوالشیخ۔ اور طبرانی یہ تینوں شیخ عصر ایک زمانے میں مدینہ طیبہ میں طالب علمی کرتے تھے۔ ایک بار انپر ایسا وقت آیا کہ خرچ کی قلت نے بہت پریشان کیا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ روزے پر روزہ رکھا۔ بھوک نے جب بہت مضطرب کیا تو اُنھوں نے حضرت سرور کائنات کا وسیلہ ڈھونڈا اور سب کے سب ملکر آستانہ پاک پر گدایانہ حاضر ہوئے

---

[1] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۳۰ [2] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۰۴ [3] مقدمہ صفحہ ۵۶۶

اور صدا دی کہ یا رسول اللہ الجوع۔ اس کے بعد طبرانی تو وہیں بیٹھ گئے اور کہا کہ یا موت آئیگی یا روزی۔ ابن مقری اور ابوالشیخ لوٹ کر فرودگاہ پر چلے آئے۔ وہ صدا خالی کب جاتی کچھ عرصے کے بعد دروازۂ مکان پر کسی نے دستک دی دروازہ جو کھولا تو دیکھا کہ ایک والا دودمان علوی مع دو غلاموں کے تشریف فرما ہیں اور غلاموں کے سروں پر بہت سا سامان ہی۔ انکو دیکھکر علوی نے کہا کہ آپ لوگوں نے میری شکایت حضور نبوی میں کی۔ خواب میں آپ نے مجھ سے فرمایا ہی کہ تمھارے پاس کچھ پہنچا دوں۔ چنانچہ یہ حاضر ہی[1]۔

شیخ الفقہا امام برقانی جب اسفرائن پڑھنے گئے تو اُن کے پاس تین اشرفیاں اور ایک درہم تھا سو اتفاق سے اشرفیاں راہ میں گم ہوگئیں درہم باقی رہ گیا۔ اسفرائن پہنچکر وہ درہم ایک نان بائی کے یہاں جمع کر دیا۔ ہر روز اُس سے دو روٹیاں لے لیتے۔ اور احمد بن بشر کے یہاں سے ایک جز کتاب کا لا کر شام تک نقل کرتے اور شام کو نقل شدہ جز واپس پہنچا دیتے تیس جز نقل ہوئے تھے کہ درہم ختم ہوگیا اور اُنھوں نے مجبور ہو کر اسفرائن سے سفر اختیار کیا[2]۔

امام ابو علی بلخی جب عسقلان میں تھے تو خرچ سے اس قدر تنگ ہوئے کہ کئی فاقوں کی نوبت پہنچی۔ اور ضعف نے لکھنے سے معذور کر دیا جب بھوک کی اذیت برداشت نہ ہوسکی تو نان بائی کی دُکان پر اس غرض سے جا بیٹھے کہ کھانے کی خوشبو سے ہی کچھ تقویت طبیعت کو پہنچ لیں[3]۔

فن حدیث کے عالی مرتبہ امام ابوحاتم رازی اپنا قصہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں زمانۂ طالب علمی میں چودہ برس بصرے رہا۔ ایک مرتبہ تنگ دستی کی یہ نوبت پہنچی کہ کپڑے تک بیچ کھائے جب کپڑے بھی نہ رہے تو دو دن بھوکا رہا آخر ایک رفیق سے اظہار حال کیا خوش قسمتی سے اُسکے پاس ایک اشرفی تھی نصف اُس نے مجھ کو دیدی[4]۔ امام ابن جریر طبری نے تنگی خرچ کے سبب سے

[1] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۸۳ [2] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۷۵ [3] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۳۷۱ [4] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۴۷

اپنے کرتے کی دونوں آستینیں بیچکر کھائی تھیں[1]۔ ابن ابی داود جب کوفے طالب علمی کرنے گئے تو صرف ایک درہم پاس تھا اُس کا باقلا خریدا۔ باقلا کھاتے اور طالب علمی کرتے[2]۔ شیخ الاسلام ابو العلاے ہمدانی کو بغداد میں کسی نے اس حال میں دیکھا کہ رات کو مسجد کے چراغ کی روشنی میں جو بلندی پر تھا کھڑے کھڑے لکھ رہے تھے۔ ظاہر ہی کہ اگر اُن کو روغن خریدنے کی مقدرت ہوتی تو یہ تکلیف وصعوبت کیوں گوارا کرتے[3]۔ حکیم ابو نصر فارابی جس کا ایک عالم میں شہرہ ہی اسکی نسبت بہت کم لوگ جانتے ہونگے کہ وہ عہد طالب علمی میں تہیدستی کی بدولت چراغ کا تیل خریدنے سے بھی معذور تھا۔ تاہم اُسکا شوق بیکار رہنے والا نہ تھا۔ رات کو پاسبانوں کی قندیلوں سے کام لیتا اور اُن کی روشنی میں کتاب کا مطالعہ کیا کرتا۔ اسی تنگ حالی میں وہ علمی ترقی کی کہ سارے جہان میں اپنا نام روشن کر دیا[4]۔

سفر آج کل مسلمانوں کی علمی دنیا میں جو افسردگی چھائی ہوئی ہی اُس پر لحاظ کرکے یہ عنوان نرا لامعلوم ہوگا۔ موجودہ حالت دیکھکر مشکل سے باور آسکتا ہی کہ کبھی ہم میں بھی ایسے لوگ تھے جو علم کی دھن میں برِ اعظم اور سمندر کاٹے کر ڈالنا ایک بات سمجھتے تھے جو ایک کتاب کی خاطر صدہا میل پیادہ پا جاتے اور جو صرف نباتات کے حالات تحقیق کرنے ملکوں ملکوں پھرتے اگر اُن کے دلوں میں وہ جوش اور دماغوں میں وہ ولولہ نہ ہوتا ہمکو ابن بیطار اور سید شریف نصیب نہ ہوتے۔ اور ابو حاتم رازی اور حافظ ابن طاہر کے کارنامے ہمارے قومی خیالوں میں فخر نہ پیدا کرتے۔ علماے سلف کے حالات دیکھنے سے عیاں ہوتا ہی کہ اُن بزرگوں کے دل میں شوق علم کی ایک بیتابی تھی جو اُن کو کسی شہر یا ملک میں قرار نہیں لینے دیتی تھی اور ایک سمندر سے دوسرے سمندر میں اور ایک برِ اعظم سے دوسرے برِ اعظم میں لیے پھرتی۔ اگر آج ہمارے دلوں میں اُسکا ایک

---

[1] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۸۰۔ [2] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۳۲۹ [3] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۱۲۰ [4] عیون۔ ج ۲ صفحہ ۱۳۴

شمہ بھی ہوتا تو ہم علم وفن میں ہر قوم وملت کے مقابلے میں پست نہ ہوتے۔ اور حق یہ ہی کہ جب ہمارے ارادے پست ہماری ہمتیں قاصر ہو رہی ہیں تو ہمارا اسلاف کے کارناموں پر اترانا اُن بزرگوں کے نام روشن کو دھبّہ لگانا ہی اور اپنے آپ کو حقیر کرنا۔ جس ملت کے پیشوا کا یہ مقولہ ہو کہ اُطلبُوا العلمَ وَلَوْ بالصِّین اُس ملت کے افراد کو سفر کا نام سُنکر لرزہ چڑھے۔ ع ھٰذا لَعَمری فی القیاس بدیعٌ اور جس قوم کے بچے بچے کے کان اس حکیمانہ مقولے سے آشنا ہوں کہ ے تا بدکان نجا نہ در گردی ✣ ہرگز اے خام آدمی نشوی ✣ وہ گھر سے قدم باہر نہ نکالے۔ ھٰذَا الشَّیٔ عُجاب۔ محدثین کے حالات پڑہنے سے لفظ " رحلت " بجائے خود ایک مقدس لفظ معلوم ہونے لگتا ہی۔ حیف۔ ایک وہ گروہ قدسی تھا کہ جس نے سیاحت کرتے کرتے خود لفظ میں تقدس پیدا کر دیا اور ایک ہم ہیں کہ گھر میں گھُسے گھُسے سارے عالم کے یہ ذہن نشین کر دیا کہ " مسلمان " اور " سفر " ان دونوں لفظوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں ے ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

یہ قصہ دراز ہی اور ہم کو دوسری داستان بیان کرنی ہی اس لیے اس سے قطع نظر کر کے ہم اپنے مدعا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سب سے اول ہم اُن سیاحتوں کا ذکر کریں گے جو علمائے سلف نے احادیث نبویہ کے حاصل کرنے کے واسطے کیں۔ کیونکہ مسلمانوں کی علمی دنیا میں سفر کا رواج ابتداءً اسی پاک فن کی بدولت ہوا ہی۔ محدثین کے سفر کا حال بیان کرنے کے بعد ہم اُن علما کا حال لکھیں گے جنھوں نے حدیث کے سوا اور علوم کے حاصل اور دقائق علمیہ کے حل کرنے کے واسطے دُور و دراز ممالک کے سفر اختیار کیے تھے۔

امام مالک نے حضرت سعید بن المُسیّب تابعی سے روایت کی ہی کہ میں ایک ایک حدیث کی خاطر راتوں اور دنوں پیادہ پا چلا[1] ہوں۔ امام دارمی نے طلب حدیث میں۔ حرمین۔ خراسان

---

[1] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۸۴

عراق۔ شام اور مصر کا سفر کیا تھا[1]۔ صحیح بخاری کے مصنّف امام بخاری نے چودہ برس کے سِن میں سیاحت شروع کردی تھی۔ اُن کی والدہ اور خواہر سفر میں نگراں تھیں۔ بخارا سے لیکر مصر تک سارے ممالک اُس عالی مقام امام کے سفر کی فہرست میں ہیں[2]۔

امام ابو حاتم رازی نے اپنی سرگزشت خود بیان کی ہی کہ میں نے تین ہزار فرسخ سے زیادہ مسافت پیادہ پا طے کی ہی۔ (ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہی لہذا اُن کی پیادہ روی نو ہزار میل سے زائد ہوئی) یہ اُن کی سیاحت کی انتہا نہیں بلکہ شمار کی حد ہی۔ کیونکہ امام ممدوح فرماتے ہیں کہ اُس کے بعد میں نے میلوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا[3]۔

امام فسوی نے تیس برس سفر میں بسر کردیئے[4]۔ شیخ الاسلام بقی ابن مخلّد نے دوسو اسّی[280] شیوخ سے حدیث روایت کی ہی۔ خود اُنھوں نے فرمایا ہی کہ میں جس شیخ کے پاس گیا پیادہ پا گیا[5]۔ محدث اندلس (سپین) ابن حیون نے حدیث اندلس۔ عراق۔ حجاز۔ اور یمن کے شیوخ کی خدمت میں حاضر ہوکر اخذ کی[6]۔ یہ معلوم نہیں کہ انھوں نے یہ سفر کس راستے سے کیا۔ لیکن نقشے کے معائنے سے واضح ہوتا ہی کہ اگر یہ سفر دریا کے راستے سے کیا گیا تو پورا بحیرۂ روم اور تمام و کمال بحر احمر اُنھوں نے طے کیا ہوگا۔ اور اگر خشکی میں کیا ہوگا تو طنجے سے لے کر سویز تک سارا بر اعظم افریقہ اُنھوں نے پے سپر کیا ہوگا اُس کے بعد اگر براہ راست یمن آئے تو کُل بحر احمر میں سفر کر کے یمن پہنچے ہوں گے اور اگر بیت المقدس وغیرہ کی جانب چلے گئے ہوں گے تو شام و حجاز و عراق میں پھر کر اُنھوں نے منزل علمی ختم کی ہوگی۔ مگر چونکہ اُن کے سلسلۂ سفر میں مصر کا ذکر نہیں اس لیے غالباً بحری راستے سے یہ سفر ہوا ہی۔ کیونکہ خشکی کے راستے میں ضرور مصر پڑتا۔

---

[1] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۱۱۴ [2] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۳۴ [3] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۴۷ [4] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۱۶۰
[5] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۲۰۵ [6] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۴

اور یہ ناممکن سا معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں کوئی طالب علم مصر جاتا اور وہاں کے مشائخ سے استفادہ نہ کرتا۔ اسپین سے یمن براہ راست ساڑھے تین ہزار میل سے زیادہ ہے۔

ابن المقری بیان فرماتے ہیں کہ میں نے صرف ایک نسخہ ابن فضالہ کی خاطر ستّر منزل کا سفر کیا تھا۔ اُس نسخے کی ظاہری حیثیت یہ ہے کہ اگر کسی نان بائی کو دیا جائے تو وہ ایک روٹی بھی اُس کے عوض میں دینا گوارا نہ کرے گا۔ (ایک منزل معمولی طور پر بارہ میل کی قرار دی گئی ہے پس اگلے علماء آٹھ سو چالیس میل ایک ایک کتاب کی خاطر طے کر ڈالتے تھے) اس کے علاوہ امام موصوف نے چار مرتبہ مشرق (ممالک ایشیا) اور مغرب (ممالک افریقہ و اسپین) کا سفر کیا تھا اور دس دفعہ بیت المقدس گئے تھے[1]۔ حافظ ابن مفرج نے سعید بن الاعرابی سے حدیث کی سماعت مکۂ مکرمہ میں کی۔ ابن راشد سے دمشق میں۔ قاسم بن اصبع سے قرطبہ (کارڈوا ملک اسپین) میں۔ ابن سلیمان سے طرابلس میں۔ محمد سے مصر میں اور دیگر مشائخ سے جدّہ۔ صنعا۔ اور بیت المقدس میں[2]۔ یہ مقامات اگر نقشے میں دیکھے جائیں تو تین براعظموں میں بکھرے ہوئے ملیں گے۔ قرطبہ یورپ میں۔ مصر افریقہ میں۔ طرابلس سے مراد اگر طرابلس شام ہے تو ایشیا میں ہے ورنہ افریقہ میں باقی مقامات ایشیا میں۔ عبرت کا مقام ہے کہ جو مقامات ایک زمانے میں ہمارے پاک مذہبی علوم کے سرچشمے تھے وہاں آج کوئی مذہب اسلام کا ماننے والا تو بڑی بات ہے جاننے والا بھی نہیں۔ اسپین میں اگر کوئی شخص اب جا کر سیاحت کرے تو کیا اُس کے گمان میں بھی آسکتا ہے کہ دُنیائے اسلام کے نامور عالم اور مشائخ بیسیوں سیکڑوں ہزاروں اس سرزمین سے اُٹھے تھے۔ ابن عبدالبر حُمیدی۔ شیخ اکبر کہاں کے تھے؟ اسی اسپین کے جو آج یورپ میں ملک بھاگے ہوئے غلام کی طرح اپنے قدیم آقا کی صورت سے بھی بیزار ہے۔ اگر ہم عبرت حاصل کریں

[1] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۸۳ [2] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۲۱۴

تو ہماری آنکھیں کھول دینے کے واسطے یہ واقعہ کم نہیں کہ مادر زاد نابینا حافظ الحدیث ابو العباس رازی اپنے نبی پاک کے اقوال وافعال کی شیفتگی میں بلخ[1]۔ بخارا۔ نیشاپور۔ اور بغداد کا سفر کرتے پھرتے تھے[2]۔ امام ممدوح باوجودیکہ دنیا کے دیکھنے سے محروم تھے تاہم اُن کی بھی سوانح عمری باب سیاحت سے خالی نہیں۔ حیف ہم پر جو خدا کی دی ہوئی ایک چھوڑ دو دو آنکھیں رکھتے ہیں عالم کو دیکھتے ہیں اور پھر بھی آنکھیں بند ہیں۔ حافظ ولید سرقسطی (باشندہ سراگوسا ملک اسپین) کے حالات میں امام ذہبی فرماتے ہیں رحل من اقصی الاندلس الی خراسان یعنی اُنھوں نے انتہائے اندلس سے خراسان تک سفر کیا۔ حافظ ممدوح سراگوسا میں پیدا ہوئے تھے اور سرزمین دینور (واقع ایران) میں آرام کر رہے ہیں[3]۔ امام ابوزکریا کے سفر کا آغاز بخارا سے اور انجام قیروان (واقع افریقیہ) پر ہے[4]۔

حافظ ابن طاہر مُقدسی نے جتنے سفر طلب حدیث میں کیے اُن میں کبھی اُنھوں نے کبھی سواری کا سہارا نہیں لیا۔ سواری اور باربرداری دونوں کا کام وہ اپنے ہی نفس سے لیتے تھے۔ سفر پیادہ پا کرتے تھے اور کتابوں کا پشتارہ پشت پر ہوتا تھا۔ مشقت پیادہ روی کبھی کبھی یہ رنگ لاتی کہ پیشاب میں خون آنے لگتا۔ اسی جفاکشی سے جو سیاحت حافظ ممدوح نے کی اُس میں حسب ذیل مقامات منجملہ اور مقاموں کے تھے۔ بغداد۔ مکہ مکرمہ۔ جزیرہ تنیس[5]۔ (واقع بحیرہ روم) دمشق۔ حلب۔ جزیرہ۔ اصفہان۔ نیشاپور۔ ہرات۔ رُحبہ[6]۔ نوقان۔ مدینہ طیبہ۔ نہاوند۔ ہمدان۔ واسط۔ ساوہ۔ اسدآباد۔ انبار۔ اسفرائن۔ آمل۔ اہواز۔ بسطام۔ خسرُو جرد جُرجان۔ آمد۔ استرآباد۔ بوسنج۔ بصرہ۔ دینور[7]۔ رَی۔ سرخس۔ شیراز۔ قزوین۔ کوفہ[8]

---

[1] بلخ سے بغداد براہ بخارا ۱۳۰۰ میل ہے ۱۲ [2] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۲۳۳ [3] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۳۳ و ۲۸۰ و ۲۸۱۔ [4] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۳۰۱ [5] بکسر تائے مثناۃ وکسرۂ نون مشدد و سکون یائے تحتانی و سین مہملہ ۱۲ [6] بضم رائے مہملہ و سکون حائے مہملہ ۱۲ [7] بکسر دال مہملہ و فتح نون ۱۲ [8] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۴۰

حافظ ابو عبداللہ اصفہانی ایک مرتبہ اپنے مقامات رحلت کی تفصیل بیان کرنے لگے کہ میں حدیث حاصل کرنے گیا ہوں۔ طوس۔ ہرات۔ بلخ۔ بخارا۔ سمرقند۔ کرمان۔ نیشاپور۔ جرجان غرض اسی طرح وہ نام لیتے گئے یہاں تک کہ ایک سو بیس مقامات کے نام لے ڈالے[۱]۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر ایک سو بیس مقاموں کے نام مسلسل لیے جائیں تو سننے والے گھبرا جائیں گے آفریں اس باہمت جوانمرد پر جو اتنے مقاموں کا سفر کرتے کرتے نہیں گھبرایا۔

واقعہ ذیل اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ کیسا شوق علم کے واسطے سفر کرنے کا اُن دنوں مسلمانوں کے دلوں میں تھا۔ امام اسمٰعیل نے جب محمد بن ایوب رازی کی خبر وفات سنی تو رونے چیخنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اور سر پر خاک ڈالی۔ اُن کی پریشانی دیکھ کر سارے گھر والے جمع ہو گئے اور پوچھا خیر ہے کیا حال ہے۔ اُنھوں دلگیر ہو کر کہا کہ تم لوگ مجھ کو سفر کرنے سے روکتے رہے آخر محمد بن ایوب وفات پا گئے اب میں اُن کو کہاں پاؤں گا۔ گھر والوں نے اُن کو تسلی دی اور انتظام کر کے ماموں کے ہمراہ شہر نسا کو ایک دوسرے شیخ وقت ابن سفیان کی خدمت میں بھیجدیا۔ اسمٰعیل کا سن اُسوقت سترہ برس کا تھا تاہم اتنی عمر تک بھی گھر میں بیٹھا رہنا اُنھوں نے مصیبت خیال کیا[۲]۔

اسی کے قریب قریب امام ابو سعد کا واقعہ ہے کہ جب وہ سولہ برس کی عمر میں سفر کر کے حافظ ابو نصر زینبی سے پڑھنے بغداد گئے تو وہاں پہنچکر اُن کی وفات پانے کی خبر سنی۔ اس جگر خراش خبر نے ایسا صدمہ ابو سعد کے دل کو پہنچایا کہ وہ چیخ کر روئے۔ طمانچوں سے منہ لال کر لیا اور حسرت سے کہا کہ من این لی علی بن الجعد عن شعبۃ[۳]

امام عزالدین مقدسی چودہ برس کی عمر میں تحصیل علم کے واسطے بغداد پہنچ گئے تھے[۴]۔ حافظ

---

[۱] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۳۰۵۔ [۲] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۶۱ [۳] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۸۰ [۴] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۱۹۳

ابو الخطاب اندلسی نے تحصیل علم کی غرض سے اولاً تمام مُلک اسپین میں سفر کیا وہاں سے فارغ ہو کر مراکش (مراکو) آئے۔ مراکش اور دیگر ممالک حبش کی سیاحت کے بعد مصر پہنچے۔ اور مصر کے بعد شام۔ عراق عرب۔ عراق عجم۔ اور خراسان کا سفر کیا۔ اور اس طرح تین برِ عظم اُن کے ملک پیما قدموں کے نیچے سے نکل گئے۔[۱]

امام ابو الولید باجی شہر باجہ میں (جو اشبیلیہ کے متصل اسپین میں واقع تھا) پیدا ہوئے تھے۔ علوم عقلیہ پڑھنے کے واسطے سفر کر کے موصل آئے اور وہاں ابو جعفر سمنانی سے ان علوم کو حاصل کیا۔[۲]

فن ادب کے مشہور امام کسائی ایک مجلس علما میں اکثر جایا کرتے تھے۔ ایک دن جو وہاں پہنچے تو بہت خستہ ہو گئے تھے۔ اپنی خستگی ظاہر کرنے کے لیے اُنھوں نے کہا "عییت" (بالتشدید) یعنی میں تھک گیا۔ اہل مجلس نے ٹوکا کہ تم غلط لفظ استعمال کر رہے ہو۔ اُنھوں نے وجہ دریافت کی تو جواب ملا کہ اگر تمھاری مراد ماندگی ہی تو اعییتُ کہو اور اگر درماندگی کا اظہار مقصود ہی تو لفظ عییت (بالتخفیف) استعمال کرو۔ کسائی کے دل پر اس اعتراض سے ایک چوٹ لگی اور فوراً مجلس سے باہر نکل آئے اور یہ تہیّہ کر لیا کہ وہ فن سیکھنا چاہیے جس سے پھر آیندہ ایسی خفّت کسی محفل میں حاصل نہو۔ یہ عزم کر کے فن ادب کے اُستاد یگانہ خلیل بصری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور پڑھنا شروع کیا۔ مگر جو رتبۂ امامت اُن کو اس فن مین ملنے والا تھا اُس کے حصول کے لیے خلیل کی مجلس کافی نہ تھی۔ ایک دن ایک بدوی نے ان پر یہ طعن کیا کہ تم کانِ ادب بنی تمیم اور بنی اسد کو چھوڑ کر عربیت حاصل کرنے بصرے آئے ہو۔ یہ چُھبتا ہوا فقرہ کِسائی کے دل میں اثر کر گیا اور اپنے علامہ اُستاد سے کسی موقعے پر اُنھوں نے پوچھا کہ

---

[۱] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۳۸۱ [۲] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۳۷۱

آپ نے فنِ ادب کہاں سیکھا۔ اُستاد نے جواب دیا کہ حجاز[1]۔ تہامہ اور نجد کے جنگلوں میں یہ سنکر کسائی کے سر میں تازہ سودا پیدا ہوا اور شہر چھوڑ کر صحرا کی راہ لی۔ اور قبیلہ در قبیلہ اتنے پھرے کہ اس فن کے امام بن گئے جسکے نہ جاننے سے شرمندہ ہونا پڑا تھا۔ کیا مبارک تھی کسائی کی غلطی جس نے لاکھوں کروروں آدمیوں کو صحیح عربی پر قادر کر دیا۔ اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہی کہ اگلے مسلمانوں کی علمی حمیّت کیسی حسّاس تھی جس کو جوش میں لانے کے لیے ادنے تحریک کافی ہوتی تھی۔ شاید بیجا نہو گا اگر ہم اس کی اور دو ایک مثالیں ہدیۂ ناظرین کریں۔ ایک دوسرے امام ادب سیبویہ کا قصہ ہی کہ ابتدائے طالب علمی میں وہ فقہ اور حدیث پڑھا کرتے تھے۔ نحو سے اس وقت تک چنداں مناسبت نہ تھی۔ اُس زمانے میں وہ حماد بن سلمہ کے مُستملی[2] بھی تھے ایک روز کسی حدیث کی روایت میں حماد نے الفاظ لیس ابا الدرداء املا کیے۔ سیبویہ نے انکو ادا کرتے وقت لیس ابو الدرداء سامعین کو سُنایا۔ شیخ نے کہا کہ غلط لفظ مت بتاؤ لیس ابا الدرداء کہو۔ اس گرفت سے سیبویہ کو نہایت انفعال ہوا اور اُنھوں نے دل میں کہا کہ میں وہ علم کیوں نہ سیکھوں جو ایسی غلطیوں سے محفوظ رکھے۔ چنانچہ اُنھوں نے نحو سیکھنی شروع کی اور اس جہد اور کوشش سے سیکھی کہ سیکڑوں برس سے طلبہ اُن کا نام لیکر نحوی ہوئے ہیں[3]۔ اشبیلیہ کے مشہور طبیب قاضی ابو بکر کو آغازِ عمر میں شطرنج کی بہت لت تھی مثل ہی کہ کار بکثرت۔ کثرت نے وہ مہارت پیدا کی کہ ان کا لقب شطرنجی پڑ گیا۔ یہ ذلیل لقب قاضی صاحب کے دل کو صدمہ پہنچاتا تھا آخر اُن کی غیرت نے یہ مشورہ دیا کہ کسی علم میں کمال پیدا

---

[1] جزیرہ نمائے عرب پانچ حصوں پر منقسم ہی۔ پہلا یمن دوسرا حجاز تیسرا تہامہ چوتھا نجد پانچواں یمامہ ۱۲ (صناجۃ الطرب)۔

[2] اگلے زمانے میں طریقۂ تعلیم یہ تھا کہ اُستاد کسی اونچے مقام پر بیٹھ کر کسی موضوع کی نسبت زبانی تقریر کرتا تھا اور شاگرد اسکو سُنتے اور ضبط کرتے تھے اس طریقے کا نام املا تھا۔ وقت ضرورت ایک یا زائد اشخاص اس غرض سے کھڑے ہو جاتے تھے کہ اُستاد کے الفاظ بعینہ شاگردوں تک پہنچاتے جائیں ان لوگوں کو مستملے کہتے تھے۔ یہ طریقہ یورپ کے لیکچر کے طریقے سے مشابہ تھا ۱۲

[3] نزہۃ صفحہ ۷۲۔

کرنا چاہیئے تاکہ اُس علم کی نسبت یہ داغ بدنامی مٹا دے۔ غور کرکے اُنھوں نے طب کو پسند کیا اور اس فن شریف میں وہ کمال اور نام پیدا کیا کہ آج قریباً سات سو برس کے بعد ان کا حال آپ میرٹھ میں سُن رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نام آوری کے سامنے وہ بدنام کنندہ لقب کیا ٹھہرتا۔ لوگ ابو بکر طبیب کو دیکھکر شطرنجی قاضی صاحب کو بُھول گئے۔[1] ادیب مشہور ابن جنی موصل میں فن نحو کا درس دیا کرتے تھے ایک دن ذرا سی میدان کے شہسوار ابو علی فارسی وہاں وارد ہوئے اور ایک مسائلے میں جو ابن جنی سے اُلجھے تو وہ دم بخود رہ گئے اُن کو حیران دیکھکر پختہ کار ابو علی نے طنزاً کہا۔ زببت قبل ان تحصرم[2] اور اتنا کہکر وہاں سے چلے آئے۔ اُن کے چلے آنے کے بعد ابن جنی نے دریافت کیا کہ یہ کون تھے۔ لوگوں نے کہا ابو علی فارسی یہ سُنکر ابن جنی مسند تدریس چھوڑکر ابو علی کی شاگردی کے شوق میں اُٹھ کھڑے ہوئے جب تک یہ اُن کی فرودگاہ پر آئیں وہ وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ آخر اگلی منزل پر جا لیا اور تلمذ کی آرزو ظاہر کرکے ساتھ ہو لیے جب تک ابو علی زندہ رہے اِنھوں نے ان کا دامن عاطفت نہیں چھوڑا۔ اور اس طرح داغ خامی اپنے دامن حال سے چُھڑا ڈالا۔[3] آمدم بر سر مطلب امام نضر بن شمیل نے چالیس برس صرف مختلف قبائل کی زبانوں کی تحقیقات کی خاطر صحرائے عرب میں بسر کر دیئے۔[4] اندلس کے طبیب ابن رومیہ نے اُن نباتات کے حالات دریافت کرنے کے لیے جو مغرب میں پیدا نہیں ہوتیں مدتوں سیاحت کی۔ اسپین سے مصر آئے اور مصر سے شام و عراق کا سفر کیا۔ اِن ممالک کے تمام نباتات کو خاص ان کی روئیدگی کے مقامات میں جاکر مشاہدہ کیا۔ اور ان کے افعال و خواص کی تحقیقات کی۔[5] اسی طرح علم نباتات کے بے نظیر عالم

---

[1] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۸۰۔ [2] نزہتہ۔ صفحہ ۴۰۸ [3] حِصرم غورۂ انگور کو کہتے ہیں اور زبیب کہتے ہیں انگور خشک کو جو کشمش کے نام سے مشہور ہے۔ پس اس عبارت کے معنی یہ ہوئے کہ تم خام ہونے سے پہلے پختہ ہو گئے ۱۲ [4] نزہتہ صفحہ ۱۱۱ [5] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۸۱۔

ضیاء الدین ابن بیطار نے خاص نباتات کی تحقیقات کی غرض سے ممالک۔ روم۔ یونان۔ اور اسپین کو چھان ڈالا۔ ان ملکوں کی تمام بوٹیاں انکی پیدائش کیجگہ جا کر دیکھیں اور اُن کے احوال تحقیق کر کے قلمبند کیے[1]۔ ابو المنظور نے بہت سی نئی نباتات ایسی دریافت کیں جن کا ذکر متقدمین کی کتابوں میں نہ تھا۔ اُن کا طریقہ یہ تھا کہ جو مقامات روئیدگی نباتات کے واسطے مشہور تھے مثلاً جبل لُبنان (شام) اُن میں پھرتے اور بوٹیوں کو دیکھتے اور جا بجا ایک مصور ہر رنگ کی رنگ لیے ان کے ہمراہ رہتا۔ نباتات کا خود مشاہدہ کر لینے کے بعد مصوّر کو دکھلاتے اور وہ اُسکے رنگ شاخ اور برگ و بیخ کا اندازہ کر کے ہو بہو اُس کی تصویر کھینچتا۔ یہ محقق طبیب ایک بار کے مشاہدہ پر قانع نہوتا۔ بلکہ نشو و نما کے مختلف مدارج میں نباتات کا معائنہ کرتا۔ ایام نمو و تازگی کی علیحدہ تصویر کھچواتا اور زمانہ کمال کی جُدا۔ اور جب وہ بوٹی خشک ہو جاتی تو ایک تیسرا نقشہ لیا جاتا۔ اسی طرح ہر بوٹی کی تصویریں اُس نے اپنی کتاب میں (جو ادویہ مفردہ کے حال میں تھی) درج کی تھیں۔ جن کو دیکھکر ناظرین کتاب ان نباتات کی مختلف اشکال صحیحہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیتے تھے۔ کاش اُن دنوں میں چھاپا ہوتا تو آج ایک عمدہ ثبوت اگلے مسلمانوں کی علمی تحقیقات کا ہم پیش کر سکتے[2]۔

علامہ سیّد شریف کو ایام طالب علمی میں یہ شوق ہوا کہ شرح مطالع خود اُس کے مصنف سے پڑھیں۔ اُسی دُھن میں وہ ہرات پہنچے اور علامہ رازی سے ملے۔ اُن کی عمر اُس وقت دسویں منزل کی انتہا پر پہنچ چکی تھی اور قُویٰ اپنی آخری بہار دکھا رہے تھے۔ کہن سال علامہؒ نے نوجوان ہمت سید کو پڑھانا اپنی طاقت سے باہر سمجھکر اُن سے کہا کہ تم میرے شاگرد مبارک شاہ کے پاس قاہرہ چلے جاؤ اُس کا پڑھانا میرا پڑھانا ہی اور چلتے وقت سفارش لکھدی۔

---

[1] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۳۳ [2] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۱۹۔

میر سید شریف کا شوق اُن کو خراسان سے مصر لے پہنچا۔ قاہرہ پہنچکر وہ مبارک شاہ سے ملے اور استاد کا خط انکو دیا۔ سفارش کے اثر سے یہ حلقۂ درس میں تو داخل کر لیے گئے لیکن نہ انکا مستقل سبق مقرر ہو سکا اور نہ جماعت میں قرارت کی اجازت ملی مجبوراً سماعت پر قانع ہونا پڑا۔ ایک شب مبارک شاہ صحن مدرسہ میں ٹہل رہے تھے کہ ایک جانب سے کسی کی آواز کان میں آنے لگی متوجہ ہو کر سُنا تو میر سید شریف کہہ رہے تھے قال المصنّفُ کذا وقال الاستاذُ کذا وَاَقولُ کذا[۱] خوبی بیان مبارک شاہ کے دل میں گھر کر گئی۔ اور صبح کو انھوں نے سیّد جرجانی کو سب طلبہ پر مقدم کر دیا[۱]۔ جہاں پیما ابن بطوطہ جب اسکندریہ پہنچا تو شیخ روزگار برہان الدین اعرج کے حضور میں بھی گیا۔ شیخ نے اثنائے ملاقات میں اُس سے اپنے تین بھائیوں کو سلام پہنچانے کی فرمایش کی۔ جن میں سے ایک فرید الدین نامے ہند میں تھے دوسرے زین الدین سندھ میں اور تیسرے برہان الدین چین میں۔ چنانچہ ابن بطوطہ نے دوران سیاحت میں ان سب کو مقامات مذکورہ میں پایا اور مشتاق بھائی کا سلام پہنچا دیا[۲]۔

اُس زمانے میں سفر جن مصیبتوں سے ہوا کرتا تھا اور سیاحت میں جو صعوبتیں اُٹھانی پڑتی تھیں وہ ذیل کے واقعے سے خیال میں آسکتی ہیں۔

امام ابو حاتم رازی فرماتے ہیں کہ سفر میں ایک دفعہ میں جہاز سے اُترا تو خرچ بالکل پاس نہیں رہا تھا۔ دو میرے رفیق اور تھے انکا بھی مضمون واحد تھا۔ ہم تینوں نے تین دن فاقے سے پیدل سفر کیا۔ آخر تیسرے دن ایک مقام پر کثرت ضعف نے تھکا کر گرا دیا۔ رفیقوں میں ایک بیچارہ بڈّھا تھا وہ گرتے ہی بیہوش ہو گیا۔ ذرا دیر کے بعد ہم دونوں نے پھر ہمت باندھکر آگے بڑہنے کا ارادہ کیا۔ بڈّھے کو دیکھا تو بالکل غافل تھا۔ مجبوراً اُس کو وہیں چھوڑا اور ہم

---

[۱] شق۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۶۸ [۲] رحلہ۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۱ [۳] یعنی مصنف کتاب نے یوں کہا۔ استاد نے یوں کہا۔ اور میں یوں کہتا ہوں۔

آگے بڑھے تھوڑی دُور چلے تھے کہ میرے حواس نے جواب دیا اور میں بھی غش کھا کر زمین پر گر پڑا
رفیق۔ بڈھے کی طرح مجھ کو بھی راہ میں پڑا چھوڑ کر خود آگے بڑھا حُسن اتفاق سے کچھ فاصلہ طے
کرنے کے بعد اُس کو ایک کشتی نظر آئی جو قریب ہی ایک مقام پر مسافر اُتار رہی تھی۔ یہ دیکھکر
اُس نے اظہار مصیبت کے لیے اپنی چادر ہوا میں اُڑائی اس نشان بیچارگی کو دیکھکر مسافر
متوجہ ہوئے اور کچھ لوگ اُس کے پاس آئے اور تشنگی سے بے دم دیکھکر پانی پلایا جب پانی
پی کر اُس کو تسکین ہوئی تو کہا کہ میرے دو رفیق اور اسی مصیبت کے مارے پیچھے چھوٹ گئے
ہیں ان کی خبر گیری ضرور ہے۔ مہربان مسافر یہ سنکر ہماری طرف آئے۔ میری آنکھ کھُلی تو دیکھا
کہ ایک آدمی مونھ پر پانی کے چھینٹے دے رہا تھا جب مجھ کو ہوش آگیا تو پانی پلایا اسکے
بعد ہم سب مل کر بے کس بڈھے کے پاس گئے اور اُس کی بھی خدمت کی۔ آخر ہم نے ایک
مقام پر چند روز ٹھہر کر آرام کیا تب جان میں جان آئی۔ حیف! ہمارے اسلاف ایسے اور ہم
اُن کے اخلاف ایسے۔ کہ ہمارے مقابلے میں دنیا کی ساری قومیں علم و حکمت کی زیادہ قدر
شناسی کی مدعی ہیں۔ اگر پچھلی ہمت کا ادنیٰ اثر بھی ہم میں ہوتا تو آج امتحان مقابلہ ہمارے واسطے
ایک مہیب مسالہ قرار نہ پاتا۔ اور ہر صیغے اور شعبے میں ہم رعایت کی ذلیل صدا بلند
نہ کرتے جس طرف کان لگایئے مسلمان طلبہ اور اسلامیہ مدارس میں افلاس افلاس کی
صدا بلند ہے۔ انصاف بالائے طاعت ست۔ لاکھ افلاس سہی لیکن چقندر کے پتے اور جڑی
بوٹی کھانے کا تو اتفاق تو نہیں ہوتا۔ سچ یہ ہے کہ شوق اور ہمت نہیں ورنہ یہی کڑوے
گھونٹ شربت کی طرح خوش گوار ہو جاتے اور ساری کڑی منزلیں آسان ہو جاتیں۔

کتابوں کا لکھنا چھاپے نے اس زمانے میں کتابوں کا وجود اتنا آسان کر دیا ہے کہ

ـــــــــــــــــــــــــــــ

ـ۵ تذ۔ ج ۲ صفحہ ۱۴۷

اب اُس وقت کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہی جو اگلے زمانے میں کتابوں کے بہم پہنچانے میں پیش
آتی تھی۔ آج کل عمدہ سے عمدہ کتاب دام خرچ کرنیسے بلا دشواری مل سکتی ہی۔ لیکن پہلے یہ
بات کہاں تھی۔ جو بھاری کام اب سیسے اور پتھر نے اُٹھا لیا ہی وہ اُس وقت کے طلبہ کو خود
کرنا پڑتا تھا۔ یعنی وہ اپنے واسطے کتابیں خود لکھتے تھے گویا چلنے کے واسطے اُن کو سڑک بھی
خود بنانا پڑتی تھی۔ شقائق نعمانیہ میں لکھا ہی کہ ابتداءً جب علامہ تفتازانی کی تصانیف[1] روم
میں پہنچیں اور درس میں مقبول ہوئیں تو اُن کے نسخے دام خرچ کرنے پر بھی نہیں ملتے تھے۔
مجبوراً علامہ شمس الدین کو علاوہ جمعے اور سہ شنبے کی معمولی تعطیلوں کے دوشنبے کی تعطیل
مدارس میں اور مقرر کرنا پڑی۔ پس ہفتے میں تین دن طلبہ کتابیں لکھتے تھے اور چار دن پڑھتے
تھے۔ کثرت مشق اور رات دن کے لکھنے نے اگلے لوگوں کو تحریر پر ایسا قادر کر دیا تھا کہ اب
اُن کی حکائتیں مشکل سے باور ہوتی ہیں۔

حافظ ابن خراش بغدادی نے جب وفات پائی تو کتابوں کے اٹھارہ صندوق چھوڑے
جن کتابوں سے اٹھارہ صندوق بھر گئے تھے اُن میں سے اکثر خود اُنکے ہات کی لکھی ہوئی تھیں
خوبی تحریر کی سند اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہی کہ محدثین کے نزدیک اُن کی لکھی ہوئی کتابیں
صحت نقل اور جودت ضبط میں حجت اور سند خیال کی جاتی تھیں[2]۔ سبط ابن جوزی فرماتے ہیں
کہ میں نے اپنے دادا (شیخ ابن جوزی) کو ایک بار سر منبر یہ کہتے سُنا کہ میں نے اپنی ان انگلیوں
سے دو ہزار جلدیں لکھی ہیں۔ جس شیخ وقت نے ڈھائی سو کتابیں تصنیف کی ہوں اس کا دو ہزار
جلدیں لکھ لینا ناممکن نہیں[3]۔ جن قلموں سے اُنھوں[4] نے حدیث شریف کی کتابیں لکھی تھیں اُن کا
تراشہ جمع کرتے گئے تھے۔ جب وفات پانے لگے تو وصیّت کی کہ غسل کا پانی اُسی تراشے سے

[1] شق ج ا صفحہ ۳۰ ۔ [2] تذ ج ۳ صفحہ ۲۲۰ ۔ [3] تذ جلد ۴ صفحہ ۱۳۸ ۔ [4] یعنی شیخ ابن جوزی نے ۔ ۱۲

گرم کیا جائے چنانچہ اُن کے غسل کا پانی اُسی پاک ایندھن سے گرم ہوا[1]۔

حضرت یحییٰ بن معین نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ میں نے اپنے ہات سے چھ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں[2]۔ امام ابو اسامہ کوفی نے ایک سو دس برس کی عمر میں وفات پائی تاہم سلسلہ تحریر آخر عمر تک قائم رہا اُن کے بیٹے نے بیان کیا ہی کہ میرے والد نے جب اشعار عرب مدوّن کیے تو کچھ اوپر اسّی قبائل کا کلام تھا۔ ایک قبیلے کا کلام شائع کر چکتے تو اُس کے شکرانے میں ایک نسخہ کلام اللہ کا لکھکر مسجد میں پہنچا دیتے۔ اس طرح اسّی سے زیادہ نسخے کلام پاک کے اُنھوں نے لکھکر وقف کر دئیے[3]۔ بعد وفات امام ابو جعفر طبری کی تصانیف کا حساب لگایا گیا تو ابتدائے شباب سے یوم رحلت تک چودہ ورق روزانہ کا اوسط پڑا۔ اور عام تحریر کا اندازہ کیا گیا تو چالیس ورق یومیہ ہوئے[4]۔ حکیم ابلمظفر مصری کے حال میں علامہ ابن ابی اصیبعہ لکھتے ہیں عجیب تر یہ بات ہی کہ اُن کے کتاب خانے میں ہزاروں کتابیں ہر فن کی تھیں۔ مگر کوئی کتاب کسی فن کی اُن کے یہاں ایسی نہیں ملتی جس پر خود اُن کے قلم کی کچھ نفیس و نادر باتیں فن کتاب کے مناسب لکھی ہوئی نہوں۔ چنانچہ میں نے اپنی آنکھ سے بکثرت طب اور دیگر فنوں کی کتابیں حکیم مذکور کے کتاب خانے کی دیکھی ہیں جن پر اُن کا نام اور فوائد متفرقہ متعلق کتاب درج تھے[5]۔ قوت تحریر پر واقعہ ذیل بھی عمدہ شاہد ہی۔ مفتی قسطنطنیہ ابو سعود رومی نے بارہا ایک ایک دن میں ہزار ہزار رقعوں کا جواب لکھ ڈالا جن میں سے ایک بھی خوبی اسلوب اور حسن معنی کے لحاظ سے گرا ہوا نہیں ہوتا تھا[6]۔

توجہ کامل اور شوق طلب — اس عنوان کے ضمن میں جو واقعات آگے مذکور ہوتے ہیں اُن میں آپ علم کو

[1] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۲۷۹۔ [2] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۱۵ [3] ابن۔ ج ا۔ صفحہ ۶۵

[4] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۷۹ [5] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۰۸ [6] العقد صفحہ ۲۸۵۔

زندگانی کی مختلف سختیوں میں پائیں گے۔کسی کو سردملک میں شب کو مسجد کے دروازے پر کھڑا دیکھیں گے۔کوئی بزرگ شدت گرما کے باعث پانی کے ایک بڑے ظرف میں بیٹھے ملیں گے کوئی عالم آپ کو بوریے پر دراز نظر آئیں گے۔کوئی اپنے جانی دشمن حاکم وقت کے خوف سے صحرا میں روپوش ملیں گے۔کسی کے دل میں "العشق نار تحرق ماسوی المطلوب" کا جلوہ دکھائی دیگا۔غرض مختلف گرم و سرد حالات جو ایک انسان پر گزر سکتے ہیں۔اُن پر آپ گزرتے دیکھیں گے۔لیکن ہر حال میں آپ اُن کے دل کو اطمینان سے اپنے مطلوب یعنی علم کی طلب میں مشغول پائینگے اور واقعات ثابت کرینگے کہ یہ حوصلہ فرسا حوادث اُن کے دلوں کو علم کی جانب سے تفرقہ پیدا کرنے میں قاصر تھے۔بعض صورتوں میں آپ دیکھیں گے کہ وہ بظاہر ایک کام میں مصروف ہیں مگر قلب اُن کا علم کی جانب ہے۔کوئی حکیم سو سو مرتبہ ایک ایک کتاب کا مطالعہ کرتا ہے۔کسی فقیہہ کے زیر مطالعہ ایک ایک کتاب پچاس پچاس برس رہی ہے۔ان تمام واقعات سے اُن کی توجہ کامل اور ماسوا سے بے نیازی کا پورا پتہ ملے گا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حصول کمال کی جانب جب تک انسان اپنے دل کو پورے طور سے مائل نہ کر دے کمال حاصل ہو نہیں سکتا۔اس زمانے کے مسلمان بھی مدارس کے حجروں میں اپنی عمریں صرف کر دیتے ہیں۔پڑھتے پڑھتے بوڑھے ہو جاتے ہیں مگر کمال تو بڑی چیز ہے اُس کا کوئی شمہ بھی اُن میں نظر نہیں آتا۔کوئی اس کے اسباب کچھ ہی بتائے مگر میں یہ کہتا ہوں کہ صرف توجہ اور ہمت کا تفاوت ہے۔اگر ہم وہی توجہ پیدا کر لیں تو وہ کمالات پھر پیدا ہو سکتے ہیں۔آیۂ پاک لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى صاف صاف بتلا رہی ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی کوشش کا پھل پاتا ہے۔جو کتابیں عُلما کے حالات میں طبقات کے طور پر لکھی گئی ہیں اُن پر نظر غائر ڈالی جائے تو عیاں ہوتا ہے کہ جتنا طبقہ بہ طبقہ جہد طلب میں تفاوت آتا گیا اُسی قدر درجہ بدرجہ

کمالات علمیہ میں تنزل ہوتا گیا۔ سلک الدُّرر میں (جو بارھویں صدی کے علما کے حالات میں ایک ضخیم کتاب ہی) ایک بھی عالم پانچویں یا چھٹی صدی کے علما کے مثل نظر نہیں آتا اس کے ساتھ ہی بارھویں صدی کے ایک عالم کی بھی جہدِ طلب پانچویں یا چھٹی صدی کے عُلما کی جانفشانی کے مشابہ نہیں۔ اگر ہم سلک الدُّرر کے کسی عالم کے حالات اُن حالات کے مثل نہیں پا جو ابن خلکان یا نزہتہ الالبائ کے علما کے ہیں اور پھر دیکھیں کہ ویسے کمال کو اول الذکر نے نہیں پایا تو بے شک ہم کو توجہ اور شوق کے سوا کسی اور سبب کے تلاش کی ضرورت پیش آئے گی لیکن جب ہم ہمتوں کا تفاوت پاتے ہیں تو پھر رفع الزام کے لیے اور اسباب کا پیدا کرنا روشِ حق سے بعید ہی۔

خیال بالا کو واقعات ذیل سے ملائیے اور اس طرح اُس کی صحت یا غلطی خود بخود منکشف ہو جائیگی۔ کمال توجہ کا اظہار فارسی کی اس مثل میں کیا گیا ہی۔ دل بیار و دست بکار۔ امام دارقطنی ایک مرتبہ ابتدائے سن میں اسمٰعیل صفار کی مجلس املا میں حاضر تھے۔ شیخ تو املا میں مصروف تھے اور یہ ایک کتاب کی نقل کرتے جاتے تھے۔ ایک شخص اُن کی یہ بے توجہی دیکھکر جھنجلایا اور کہا کہ تم نقل کتاب میں مشغول ہو پھر تمہارا سماع کس طرح قابل وثوق ہو سکتا ہی۔ دارقطنی نے یہ اعتراض سُنکر کہا کہ سماع سماع میں فرق ہوتا ہی تم تو ہمہ تن متوجہ ہو کر سُن رہے ہو بتلاؤ تو شیخ نے ابتک کتنی حدیثیں روایت کی ہیں۔ معترض کو مجموعی تعداد کا خیال نہ تھا لہذا اس سوال کا جواب نہ دیسکا۔ دارقطنی نے کہا کہ اٹھارہ حدیثیں اس وقت تک املا ہوئی ہیں۔ پہلی کا یہ متن ہے یہ اسناد۔ دوسری کا یہ متن ہی یہ اسناد۔ غرض اسی طرح وہ ساری حدیثیں سُنا دیں۔ حاضرین اُنکا ضبط دیکھکر دنگ رہ گئے[1]۔

---

[1] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۰۰۔

ایک مرتبہ دو شیخ خراسان سے مکہ مکرمہ میں آئے اور حرم محترم کے دو جانب بیٹھ کر اُنھوں نے ایک ہی وقت میں روایت حدیث کی۔ دونوں کے سامعین اور مُستملی جُدا جُدا تھے۔ حافظ کبیر اثرم دونوں کے بیچ میں بیٹھ گئے اور دونوں کا بیان برابر لکھتے رہے بیشک یہ توجہ کی یک سوئی کا کرشمہ تھا جس نے ایک سامع کو دو سامعوں کی قوت دیدی۔ بہت سے حاضرین مجلس ایسے ہوتے ہیں کہ سب کچھ سُننے کے بعد بھی ان کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کیا سُنا اور کم توجہی اُن کو نزدیکان بے بصر کا خطاب دلاتی ہے[۱]۔ علی بن الحسن راوی ہیں کہ ایک شب میں نماز پڑھ کر مسجد سے باہر آنے کو حضرت عبداللہ بن المبارک کے ساتھ ساتھ اُٹھا اُس رات کو سردی کی بہت شدت تھی دروازے پر پہنچکر ابن المبارک نے ایک حدیث کا ذکر چھیڑا جب وہ فرما چکے تو میں نے اُس کی نسبت کچھ کہا میرے بعد پھر اُنھوں نے کچھ بیان کیا۔ غرض اسی طرح سلسلۂ کلام جاری تھا کہ فجر کی اذاں ہوئی اور ہم دونوں مسجد کو لوٹ آئے[۲]۔ حافظ حدیث حُمیدی۔ میورقی جزیرۂ میورقہ[۳] میں پیدا ہوئے شام وعراق میں علم حاصل کیا اور بغداد میں آکر رہے گرمیوں میں جب شب کو لکھنے بیٹھتے اور گرمی ایذا پہنچاتی تو ایک بڑے سے ظرف میں پانی بھرتے اور اُس کے اندر بیٹھکر لکھتے[۴]۔

ابو عمرو بن العلاء (امام ادب) ایک زمانے میں سفاک حجّاج ابن یوسف کے خوف سے صحرائے عرب میں بھاگے پھرتے تھے۔ ادھر تو جان کے لالے پڑ رہے تھے۔ اُدھر اس علامۂ ادب کو یہ تلاش تھی کہ آیا لفظ فرجہ (بمعنی کشایش) بالضم ہی یا بالفتح ایک روز اثنائے بادیہ پیمائی میں ایک قائل کو اُنھوں نے یہ شعر پڑھتے سُنا ــــ ربما تجزع النفوس من الامرِ لَہٗ فَرجَۃٌ کَحَلِّ العِقالِ ۔ فرجہ کو اُس نے زبر سے ادا کیا۔ یہ شعر پڑھ کر وہ بدوی ابو العلا

---

[۱] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۴۹ [۲] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۰۲ [۳] مجارکا واقعہ بحیرۂ روم [۴] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۱۸

کی طرف مخاطب ہوا اور کہا سنتے ہو ظالم حجاج مر گیا۔ ابو العلا کہتے ہیں کہ مجھ کو اُس وقت تمیز نہ ہو سکا کہ آیا میں کس بات سے زیادہ خوش ہوا۔ لفظ فرجہ کی صحت ہو جانے سے یا اپنے مدعی جانی کی خبر وفات پانے سے۔ اس حکایت سے معلوم ہوتا ہی کہ اُس شیفتۂ علم کے نزدیک ایک ایک علمی مسالہ جان کے برابر عزیز تھا۔ اُسی کی بدولت ابو العلا کو یہ بلند مرتبہ حاصل ہوا کہ امام فن قرار پائے۔ جو لوگ اپنی جسمی آسایشوں کو بھی علم پر قربان نہ کرسکیں وہ کیا شان حاصل کرسکتے ہیں۔ اب مدرس بہت اور مدارس بہت لیکن شوق وہمت نایاب اس لیے ہماری علمی محفلوں میں ہر طرف سناٹا سا ہے۔[۱]

ابو عبید بن سلام نے ایک بار اپنے تلامذہ سے کہا کہ میں نے چالیس برس اپنی کتاب غریب الحدیث کی تصنیف میں صرف کیے ہیں۔ اکثر فوائد مجھ کو لوگوں سے باتوں باتوں میں ہات لگ جاتے تھے اور میں اُن کو موقع موقع سے اُس کتاب میں درج کرتا جاتا تھا۔ ان فائدوں کے حاصل ہونے سے اتنی خوشی مجھ کو حاصل ہوتی کہ میں ساری ساری رات فرط مسرت سے جاگتا رہتا۔ تم چار پانچ مہینے بھی میرے پاس آکر رہتے ہو تو کہتے ہو کہ ہم بہت رہے۔[۲]

حضرت امام زُہری کا مطالعے کے وقت یہ عالم ہوتا کہ ادھر اُدھر کتابیں ہوتیں اور اُن کے مطالعے میں ایسے مصروف ہوتے کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی۔ بی بی کو کب گوارا ہوسکتا ہی کہ اُس کے سوا کسی اور کی اس قدر گنجایش شوہر کے دل میں ہو۔ ایک دن بگڑ کر کہا وَاللهِ لَهٰذِهِ الْكُتُبُ اَشَدُّ عَلَىَّ مِن ثَلٰثِ ضَرَائِرَ یعنی قسم ہے رب کی یہ کتابیں مجھ پر تین سوکنوں سے زیادہ بھاری ہیں۔[۳] امام شافعی کے جلیل القدر شاگرد امام مزنی نے اپنے اُستاد کی کتاب الرسالہ کا پچاس برس مطالعہ کیا اور وہ خود ناقل ہیں کہ ہر مرتبہ کے مطالعے میں

[۱] نزہتہ۔ صفحہ ۳۲ [۲] ابن س ج ا۔ صفحہ ۴۱۹ [۳] ابن۔ ج ا۔ صفحہ ۴۵۱

مجھ کو نئے نئے فوائد حاصل ہوتے گئے۔[1]

ارسطو کی کتاب النفس کا ایک نسخہ کسی کے ہات لگا جس پر حکیم ابونصر فارابی کے قلم کی یہ عبارت تحریر تھی۔ انّی قرأتُ ھٰذا الکتابَ مِأۃ مرّۃٍ یعنی میں نے اس کتاب کو سو مرتبہ پڑھا ہی۔[2]

شیخ الرئیس کے مطالعے کی بھی ایک حکایت قریب قریب اس کے ہی جس کو شیخ نے خود بیان کیا ہی۔ ابن سینا کا بیان ہی کہ ایام طالب علمی میں جب مین نے کتاب ما بعد الطبیعۃ کا مطالعہ شروع کیا تو مطلقاً وہ میری سمجھ میں نہیں آئی اور نہ واضع فن کی کوئی غرض مفہوم ہوئی۔ انتہا یہ ہی کہ چالیس مرتبہ میں نے اس کا مطالعہ کیا۔ عبارت تو برزبان ہو گئی لیکن مُدعا نے اپنی جانب سے بالکل مایوس کر دیا۔ ع مدعا عنقا تھا اُس کے عالَمِ تقریر کا۔ اتفاقاً اُسی عرصے میں ایک روز عصر کے وقت کتاب فروشوں میں میرا گزر ہوا وہاں ایک شخص ایک کتاب لایا اور مجھ سے کہا کہ یہ کتاب فن ما بعد الطبیعۃ میں ہی آپ لے لیجیے۔ چونکہ میں اس فن کو بے معنی خیال کر چکا تھا اس لیے خریداری سے انکار کر دیا۔ دلال نے منّت کی اور کہا کہ کتاب سستی ہی صرف تین درہم قیمت ہی اور مالک ضرورت مند ہی میں نے اُس کے اصرار سے مجبور ہو کر کتاب لے لی۔ خریدنے کے بعد کھول کر دیکھی تو ابونصر فارابی کی تصنیف نکلی جسمیں مصنف نے اغراض کتاب ما بعد الطبیعۃ سے بحث کی تھی۔ میں خوش خوش مکان پر آیا اور اسکے مطالعے میں مصروف ہوا۔ اصل کتاب چونکہ پہلے سے ازبر تھی اس لیے نو خرید کتاب کے پڑھتے ہی سب مشکلیں آسان ہو گئیں۔[3]

ابو العباس ثعلب نے بغداد میں اسحق موصلی کے کتاب خانے میں ایک ہزار جزفن لغت کے

---

[1] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۱ ۳ [2] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۰ ۷ [3] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۴۔

دیکھے جو سب کے سب اسحق کی سماع میں آچکے تھے[1]

مولانا حماد الدین رومی نے ایک رات طلبہ کے حجروں میں مخفی طور پر گشت کیا۔ ایک طالب علم کو دیکھا کہ تکیے سے لگا ہوا مطالعۂ کتاب میں مصروف ہی دوسرے کو دیکھا کہ دو زانو مستعد بیٹھا ہی کتاب نے پر مطالعہ ہی اور موقع موقع سے کچھ لکھتا بھی جاتا ہی۔ یہ دیکھ کر تجربہ کار اُستاد نے اوّل کی نسبت کہا انہ لایبلغ درجۃ الفضل[2] دوسرے کی نسبت فرمایا سیحصّل الفضلَ ویکونُ لہ شانٌ فی العلم[3] تجربے نے ثابت کر دیا کہ یہ پیشین گوئی بالکل سچی تھی[4]۔

یہاں یہ امر قابل لحاظ ہی کہ امام زہری ہوں یا امام مزنی۔ حکیم فارابی ہوں یا شیخ الرئیس ان کے علمی کمالات کی اصل بنیاد یہی مطالعے کی کثرت تھی کہ ایک ایک کتاب کو سو سو بار پڑھتے تھے۔ اور پچاس پچاس برس دیکھتے۔ اب مطالعہ معدوم لہذا علمیت معلوم۔ بیدہ ہیں وہ لوگ جو ان بزرگوں کی جاں کاہیوں کو نظر انداز کر کے اُن کے علمی کمالات کو محض اُس زمانے کے آثار کا ثمرہ بتاتے اور اپنے زعمِ باطل میں اپنے لیے ایک عذر تراشتے ہیں۔ اگر ابو نصر یا شیخ الرئیس کی سی جانفشانی آج کل کے مسلمان کریں تو ضرور اُن کے برابر ہو سکتے ہیں بلکہ اگر جانفشانی کو اُن کی جانکاہی سے بڑھا دیں تو اُن سے بڑھ کر ہو سکتے ہیں۔ علم و حکمت کچھ نبوت نہ تھی جو کسی ذات پر ختم ہو گئی اور ہم پر یہ ایمان لانا واجب ہو گیا کہ فارابی اور شیخ کمالاتِ علمیہ کو ختم کر گئے

فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

ابو البرکات طبیب مشہور ابتدا میں موسوی ملت کے پیرو تھے اُس عہد کے استاد طب ابو الحسن کی یہ آن تھی کہ وہ منکرین حضرت مسیحا کو طب نہیں پڑھاتے تھے۔ ابو البرکات اُن کے پاس گئے

---

[1] ابن۔ ج ا۔ صفحہ ۹۶ [2] یہ مرتبہ فضیلت کو کسی طرح نہیں پہنچ سکتا [3] یہ البتہ فاضل ہوگا اور شان علمی حاصل کرے گا۔ [4] شق۔ ج ا۔ صفحہ ۳۰

لیکن ناکام واپس آئے۔ اُس طرف سے جب مایوس ہوئے تو شوق نے ایک اور راہ بتلائی یعنی اُنھوں نے دربان کو ملایا اور درس کیوقت دروازے میں چھپکر بیٹھے رہنے کی اجازت لے لی۔

بسندرست اینکہ گاہے بینم آں دیوار بیرون را　　نخواہم داد دربان ترا بہر درون زحمت

سال بھر کامل اسی طرح باکمال اُستاد کی تعلیم کا فیض حاصل کرتے رہے۔ ایک روز ہی مسألہ میں اُلجھاؤ پڑ گیا اور کسی طرح گتھی نہ سُلجھی۔ آخر چھپے رستم ابو البرکات جسارت کرکے نکل آئے اور کہا کہ اجازت ہو تو کچھ میں بھی عرض کروں۔ اُستاد نے اجازت دی اور اُنھوں نے اُسکو جالینوس کے قول سے حل کرکے کہا کہ فلاں روز یہ قول آپ ہی نے نقل فرمایا تھا۔ ابو الحسن نے حیرت سے پوچھا کہ تم نے میرا بیان کیونکر سُنا۔ اُنھوں نے صورت حال گزارش کی حکیم موصوف کے دل پر اُن کے شوق کا گہرا اثر پڑا اور اعتراف کیا کہ ایسے طالب کو محروم رکھنا حلال نہیں۔ چنانچہ اُسی روز ابو البرکات کو شامل درس کرلیا[1]

خطیب تبریزی شارح حماسہ کو ایک کتاب لغت ابو المنصور کی تصنیف ملی۔ جو کئی چھوٹی چھوٹی جلدوں میں تھی۔ اُس کے مطالب حل کرنے وہ اپنے شہر کے ایک عالم لغت کے پاس گئے۔ عالم موصوف نے اُنکو یہ مشورہ دیا کہ ابو العلا معری کے پاس چلے جاؤ۔ خطیب نے اُن اجزا کو ایک تھیلے میں بھرکر پشت پر ڈالا اور پیادہ پا تبریز سے مَعَرَّہ (واقع ملک شام قریب حماۃ) کو چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں اُس کتاب کی جلدیں پسینے سے ایسی نمناک ہوگئی تھیں کہ بغداد میں لوگوں نے دیکھیں تو گمان کیا کہ پانی میں بھیگ گئی ہیں۔ غرض اسی حال میں مَعَرَّہ پہنچے اور ابو العلا کی خدمت میں حاضر ہوکر اُس کی مشکلات حل کیں[2]۔ علامہ ابن ابی اُصیبعہ نے اپنے عم مکرم رشید الدین طبیب کی طالب علمی کا حال کسی قدر تفصیل سے

---

[1] عیون۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۷۹　[2] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۳۳

لکھا ہے۔ ہم اُس کو زمانہ ماضی کے طرز طالب علمی اور طریقہ کسب علوم ظاہر کرنے کے لیے
یہاں نقل کرتے ہیں۔ رشیدالدین نے اوّلاً کلام اللہ تمام ضروری مراتب کے لحاظ کے
ساتھ حفظ کیا۔ حفظ کلام پاک سے فارغ ہوکر فن حساب کی تحصیل کی۔ حساب کے بعد فن طب
پڑھنا شروع کیا۔ مصر کے رئیس الاطبا اُن کے والد کے دوست تھے اس لیے رشیدالدین
کو انھوں نے خود طب شروع کرائی اور جالینوس کے سولہ رسالے پڑھائے جنمیں سے چند
ابتدائی لفظ بہ لفظ حفظ کیے گئے۔ ان رسالوں کو رئیس الاطبا سے پڑھ کر اور اساتذۂ فن سے
سبق لینے لگے۔ نری کتاب خوانی پر قناعت نہ تھی بلکہ سبق سے فارغ ہوکر بیمارستان
(شفاخانہ) جاتے اور وہاں کے مریضوں کو دیکھکر معالج اطبا نے جو مرض تشخیص اور علاج تجویز
کیا ہوتا اُس کو سُنتے۔ اسی ضمن میں فن کحّالی (آنکھ بنانا) سیکھا اور اُس کا عمل نفیس الدین
سے (جو بیمارستان میں اسی صیغے کے افسر اعلیٰ تھے) حاصل کیا اور جرّاحی کی مشق بھی شفاخانہ
مذکورہ میں کی۔ فن طب کے ان مشاغل کے ساتھ اور علوم سے بھی وہ بے خبر نہ تھے۔ ادب
اور فلسفہ عبداللطیف بغدادی سے اور منطق کا ایک سبق علوم حکمیہ کے اُستاد سدیدالدین
منطقی سے پڑھتے۔ ابو محمد جعفری سے فنِ نجوم اور ابن الدیحور سے فن موسیقی حاصل کرتے
بیس برس کی عمر میں شام پہنچکر اُنھوں نے مطب شروع کر دیا۔ بااین ہمہ طب رضی الدین سے
پڑھتے رہے اور وہاں کے مشہور اُدبا سے ادب۔ اتفاقاً اُن کے اُستاد عبداللطیف بغدادی
بھی وہاں پہنچ گئے۔ تو اُن سے فلسفے کا مشغلہ پھر جاری کر دیا۔ اس جانفشانی کا یہ نتیجہ ہوا
کہ ہنوز اُن کا سن پچیس برس کا نہوا تھا کہ طب میں اُن کو نمود حاصل ہو چلی اور مذکورۂ بالا
علوم کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔ علاوہ اِن علوم کے رشیدالدین زبان ترکی اور فارسی
میں بھی ماہر تھے۔ بلکہ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ حکایت بالا سے یہ بات ثابت ہوتی ہے

کہ اگلے اطبا اس فن شریف کے تمام شعبے حاصل کرتے تھے۔ اور آج کل کے اطبا کی طرح اُنکا علاج دوسروں کے بھروسے پر نہیں چلتا تھا[۱]۔ امام طبرانی کی وسعت معلومات دیکھکر ایک شخص نے اُنسے دریافت کیا کہ آپ کا علمی خزانہ اس قدر مالا مال کیونکر ہوا۔ تو امام ممدوح نے فرمایا کہ جانِ عزیز تیس برس میری کمر نے بوریے کے سوا اور کسی بستر کا لطف نہیں اُٹھایا[۲]

امام ادب ثعلب ناقل ہیں کہ پچاس برس سے برابر میں ابراہیم حربی کو اپنی ہر مجلس لغت و ادب میں موجود پاتا ہوں[۳]۔ امام رازی کو تاسّف ہوتا تھا کہ کھانے کا وقت کیوں علمی مشاغل سے خالی جاتا ہی۔ چنانچہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ۔ واللّٰہ انی اتاسفُ فی الفوات عن الاشتغال بالعلم فی وقت الاکل فانّ الوقتَ والزمانَ عزیزٌ۔ یعنی خدا کی قسم مجکو کھانے کے وقت علمی مشاغل کے چھوٹ جانے پر افسوس آتا ہی کیونکہ فرصت وقت بہت عزیز چیز ہے[۴]

در بزم وصالِ تو بہنگامِ تماشا نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

امام رازی اگر اوقات کو عزیز نہ سمجھتے تو نہ اُن پر علوم کے راز کھُلتے اور نہ اُن کو کوئی امام کہتا ہے[۵]۔ محویت شوق کا یہ لطیفہ بھی قابل سُننے کے ہی۔ کہ ادیب مشہور ابو محمد اعرابی اپنے چہرے پر روغن مل کر آفتاب کے سامنے بیٹھا کرتے تھے تاکہ اُن کا رنگ بدویوں کی طرح کالا ہوجاے اور اعرابی کا لقب ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے اُن پر صادق ہو چنانچہ میدان طلب میں اُن کو یہ سُرخروئی حاصل ہوئی کہ اسود کا خطاب مِلگیا۔ اور آج تک اسی لقب سے وہ تاریخ میں مشہور ہیں۔ فدائیان شوق کا یہ بھی ایک رنگ ہی[۶]۔ مولانا خسرو سلطان محمد خاں فاتح قسطنطنیہ کے وقت میں نہایت باوقار اور عہدہ قضا پر ممتاز تھے۔ اگرچہ بہت سے خدم

---

[۱] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۴۸۔ [۲] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۱۸۔ [۳] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۶۲ [۴] عیون۔ ج ۲ صفحہ ۲۳ [۵] نزہتہ۔ صفحہ ۴۳۷۔

انکی خدمت میں تھے تاہم مطالعے کے کمرے میں اپنے ہات سے جھاڑو دیتے چراغ روشن کرتے اور آتشخانے میں آگ سلگاتے تھے۔ اسحق بن سلیمان طبیب سو برس کے ہو کر فوت ہوئے اُن کے کوئی اولاد نہ تھی اور نہ مدت العمر اُنھوں نے شادی کی۔ آخر عمر میں ایک مرتبہ کسی نے اُنسے پوچھا کہ آپ کے دل میں اولاد کی تمنّا ہی۔ تو اُس دانا حکیم نے جواب دیا کہ اپنی کتاب حمیات کے ہوتے ہوئے اولاد نہونے کا کبھی خیال بھی مجھ کو نہیں آتا۔[1]

امام یحیٰی ناقل مُوطّا مدینہ منوّرہ میں ایک روز امام مالک کے درس میں حاضر تھے کہ غوغا اُٹھا کہ ہاتھی آیا۔ عرب میں ہاتھی عجوبہ چیز ہے اس آواز کے سُنتے ہی سارے طلبہ درس چھوڑ کر بھاگ اُٹھے مگر یحیٰی اُسی طرح اطمینان سے بیٹھے رہے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ یحیٰی! تمھارے مُلک اندلس میں ہاتھی نہیں ہوتا تم بھی جاکر دیکھ آؤ۔ اُن کے دل میں دوسری خیال بس رہا تھا۔ جواب دیا کہ حضرت! اندلس سے میں آپ کو دیکھنے اور علم سیکھنے آیا ہوں ہاتھی دیکھنے کے واسطے بے خانماں نہیں ہوا۔ ؎

بہ بست دیدۂ مجنوں ز خویش و بیگانہ　　　چہ آشنا نگہے بود چشم لیلےٰ را[2]

ابو بکر بن بشار ادب کے مشہور امام بغداد میں شاہزادوں کے اتالیق تھے۔ ایک روز قصر خلافت کو جاتے ہوئے نخاس سے گزرے وہاں اُن دنوں ایک جاریہ آئی ہوئی تھی جس کے حُسن اور سلیقے کا سارے بغداد میں شہرہ تھا۔ ابن بشار اُس کو دیکھ کر مفتوں ہو گئے جب دار الخلافہ میں پہنچے تو خلیفہ نے پوچھا کہ آج دیر میں کیوں آئے اُنھوں نے ماجرا عرض کیا۔ یہ سُنکر خلیفہ نے درپردہ خدام کو حکم دیا کہ وہ جاریہ خریدکر ابن بشار کے مکان پر اُن کے پہنچنے سے پہلے پہنچا دی جائے۔ جب علامہ ممدوح مکان کو واپس آئے تو جاریہ کو بیٹھا پایا[3]

---

[1] شق۔ ج ۱ صفحہ ۱۲۶ [2] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۳۷ [3] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۱۶۔

دریافت کیا تو حال معلوم ہوا۔ اُس کو تو اُنھوں نے بالاخانے پر بھیجدیا اور خود وہیں بیٹھکر ایک علمی مسائے پر (جس کی تحقیقات میں وہ ان روزوں مصروف تھے) غور کرنے لگے طبیعت تو اور ہی طرف لگ رہی تھی اُلجھنے لگے۔ قلب کا یہ رنگ دیکھکر ابن بشار نے خادم کو آواز دی اور کہا کہ اس شہر آشوب کو لیجا کر واپس کر آؤ۔ میرے دل میں اُس کی اتنی قدر نہیں ہی کہ میرے خیال کو علم سے پھیر لے۔ چنانچہ خادم گیا اور جاریہ کو واپس کر آیا[1]۔

حفظ و استحضار علمی

یہ ایک مشہور مقولہ ہی کہ علم سینہ بہ از علم سفینہ۔ عُلما کا ایک دَور تھا جب کتاب کا وجود بھی مسلمانوں میں نہ تھا۔ جو کچھ اُستادوں سے پڑھتے اور سیکھتے۔ صفحہ حافظہ پر ثبت کرنا پڑتا۔ یہاں تک کہ کاغذ و قلم کی مدد کو وہ عار سمجھتے تھے چنانچہ بعض علماے سلف فخر یہ بیان کرتے کہ ہم نے کبھی سپیدی پر سیاہی کے دھبے نہیں ڈالے۔ گویا اُن کے دماغ کتاب خانے تھے جن میں علمی مسائل خوبی اور خوش اسلوبی سے چُنے ہوئے تھے۔ اسی قوت حافظہ کی وجہ سے اُس زمانے میں تعلیم کا طریقہ املا کے طرز پر تھا۔ حق یہ ہی کہ جیسے اساتذۂ فن اس روش تعلیم نے پیدا کیے وہ کتاب خوانی سے پیدا نہ ہوسکے۔ جتنے فن آج اسلام میں مدون ہیں اُن کے رؤسا و کملا اُس عصر میں ملیں گے جب طریقۂ املا رائج تھا۔ متاخرین کا سرمایۂ فخر حاشیہ و شرح نویسی ہی متقدمین کو مجتہدانہ قوت پر ناز تھا اُن بزرگوں کے حفظ و استحضار علمی کے واقعات دیکھ کر یہ اندازہ ہوسکتا ہی کہ کیسی شاقہ محنتیں وہ علوم کی تحصیل میں برداشت کرتے ہوں گے۔ اُن حکایتوں پر اپنی حالت پر قیاس کرکے بدگمانی کی نظر ڈالنا آئین حق سے بعید ہی۔ ظاہر ہی کہ انسان کے تمام قُویٰ مشق اور کثرت کار سے ترقی کرتے ہیں اور ترقی کی کوئی حد معین نہیں

[1] نزہتہ۔ صفحہ ۳۳۶۔

آیندہ دورانِ بیان میں آپ کو ایسی حکائتیں ملیں گی جن کو معتبر مورخین نے چشمدیدہ لکھا ہے۔
یا دوسری عینی شہادت کو نقل کیا ہے بعض ائمہ ثقات نے اپنے حالات خود نقل کیے ہیں۔ ان
حالتوں میں میری رائے ناقص میں کسی شک و شبہ کی گنجائش بہت کم رہتی ہے۔ رفتہ رفتہ
کتابیں تصنیف ہوئیں اُن پر اعتماد بڑھا اور قوت حافظہ بیکاری کی وجہ سے مضمحل ہوتی گئی
جو علم متقدمین کے دماغوں میں تھا وہ متاخرین کے کتاب خانوں میں آکر ٹھہرا اور نوبت
یہاں تک پہنچی کہ اگلوں کے حالات پچھلوں کو قیاس سے بھی باہر معلوم ہونے لگے۔
غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ متقدمین کی قوت علمیہ کو ان تین ذرائع سے
بہت مدد ملتی تھی۔ اولاً حفظ۔ ثانیاً کتابوں کا اپنے ہات سے لکھنا۔ ثالثاً کثرت مطالعہ
متاخرین سے رفتہ رفتہ یہ سب سلب ہوگئے۔ حفظ کو کتابوں کی تصنیف نے باطل کر دیا۔
اور تحریر کتابوں کی کثرت سے فضول ہوگئی اور اس زمانے میں جبکہ مطابع کتابوں کے وجود
سے دنیا کو مالامال کر رہے ہیں کتابوں کی نقل کرنی تضیع اوقات سے زائد نہیں خیال کیجا سکتی۔
ایک مطالعہ باقی تھا اُس کو ہمارے زمانے میں اُس طرز تحشیے نے بالکل غارت کر دیا جو اب
بدقسمتی سے رائج ہوگیا ہے۔ ضمائر کے مرجعے۔ اشاروں کے مشار الیہ ہندسوں کی مدد سے
ظاہر کیے جاتے ہیں۔ قریباً ہر ہر لفظ پر حاشیہ بلکہ حواشی نقل کیے جاتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ
طلبہ اِن کتابوں کو خرید کر نہ مطالعے کی محنت شاقہ اُٹھاتے ہیں نہ اساتذہ کی تقریروں کو
پورے طور سے قابو میں کرتے ہیں۔ اسی اعتماد نے کہ ہماری کتاب میں سب کچھ لکھا ہے جب
ضرورت ہوگی دیکھ لیں گے دماغی قوت کا بالکل ستیاناس کر دیا۔
مجھ سے اس عہد کے ایک مشہور فاضل نے اپنی طالب علمی کا قصہ بیان کیا کہ میر زاہد
رسالہ پڑہنے کے وقت ہمارا یہ عالم تھا کہ جو جو رموزا و رنکات استاد کی زبان سے نکلتی ہماری

یہ کوشش ہوتی کہ دماغوں میں نقش ہوجائیں۔ کیونکہ اگر اُستاد کی زبان سے نکل کر دماغوں میں نہ ٹھہرتے تو پھر کہاں ملتے۔ غرض پڑھتے وقت اُستاد کے بیانوں کو پوری توجہ سے سُن کر خیال میں رکھتے درس سے فارغ ہوکر اُن کا خلاصہ لکھتے اور لکھے ہوئے کو یاد کرتے تھیں ایام دنوں میں لکھنو یا کانپور سے رسالہ مذکور محشّٰی ہوکر نکلا اور نکلتے نکلتے مدارس میں پھیلا۔ اُس کے خریدتے ہی طلبہ کی ہمت میں قصور آگیا اور اُنھوں نے سمجھ لیا کہ جو اُستاد کی زبان پر ہے وہ ہمارے پاس موجود ہی۔ پھر جانفشانی بیکار ہی افسوس ہی کہ کتابوں میں سب کچھ تھا مگر اُن کے دماغوں میں کچھ بھی نہ آیا۔ جو کتابیں اگلے اساتذہ کو دیکھنے کو نہ ملتی تھیں آج وہ دکانوں میں بھری پڑی ہیں۔ لیکن علم کا قحط ہی۔

امام ابوعیسیٰ ترمذی مصنف جامع ترمذی (جو صحاح ستہ میں شامل ہی) فرماتے ہیں کہ میں نے دو جز ایک شیخ کے روایت کردہ احادیث کے لکھے تھے۔ حُسن اتفاق اُسی عرصے میں خود وہ شیخ مجھ کو مل گئے میں نے احادیث مذکورہ کی اجازت طلب کی۔ اور اُنھوں نے میری استدعا قبول فرما کر اُن احادیث کو سُنانا شروع کردیا۔ مجھ کو خیال تھا کہ مذکورہ بالا دونوں جز میرے پاس ہیں۔ اب جو دیکھتا ہوں تو بجائے اُن کے دو سادے جُز میں نے غلطی سے رکھ لیے تھے۔ مجھ سے سوائے اس کے کچھ نہ بن پڑا کہ وہی سادے جزہات میں لیکر شیخ کی حدیثیں سُننے لگا۔ سُو اتفاق سے شیخ کی نظر اُن اوراق پر پڑ گئی اور بگڑ کر کہا کہ تم کو مجھ سے شرم نہیں آتی۔ میں نے اصلی ماجرا بیان کیا اور کہا کہ جو حدیث آپ سُناتے ہیں مجھ کو یاد ہوتی جاتی ہے۔ شیخ کو میرے قول کا اعتبار نہ آیا۔ اور فرمایا سُناؤ۔ میں نے سب سُنی ہوئی حدیثیں لفظ بہ لفظ سُنا دیں۔ اُن کا شبہ اب بھی نہ گیا۔ اور کہا کہ معلوم ایسا ہوتا ہی کہ یہ حدیثیں میرے سُنانے سے پہلے تم حفظ کرچکے تھے۔ میں نے گزارش کی کہ اور نئی حدیثیں بطورِ امتحان

روایت فرمائیے۔ چنانچہ چالیس حدثیں اُنھوں نے نئی سُنائیں اُن کو بھی میں نے فوراً دُہرا دیا اور ایک بھی غلطی نہیں کی[1]۔ واقعۂ بالا سے معلوم ہوتا ہی کہ کثرتِ مشق اُن کے حافظے کی قوت کو کیسا بڑہا دیتی تھی۔ کہ غور سے سُننا اور حفظ ہوجانا یہ دونوں عمل اُن کے واسطے ایک ہوگئے تھے۔ داؤد ابن سمعہ نے ایک بار کہا کہ لوگ حفظ کے بارے میں ابو حاتم رازی اور ابو زرعہ کی نظیر دیا کرتے ہیں میں نے وا اللہ قرطمہ سے بڑہ کر کوئی حافظ نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ میں اُنکی خدمت میں حاضر ہوا تو اُنھوں نے اپنی کتابوں کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ ان کتابوں میں سے جس کو چاہو اُٹھا لو میں حفظ سُنادونگا۔ امتحاناً میں نے ایک کتاب اُٹھا کر کہا کتابُ الاَشربہ۔ میں نے اتنی تحریک کی تھی کہ اُن کی قوتِ حافظہ کا چشمہ رواں ہوگیا اور ساری کتاب سُناڈالی[2]۔

خطیب بغدادی اپنی تاریخ بغداد میں لکھتے ہیں کہ ادیب مشہور ابو عمرد زاہد۔ قاضی محمد کے صاحبزادے کو ادب کی تعلیم دیتے تھے۔ ایک روز اُنھوں نے اپنے شاگرد کو لُغت کے تیس مسلے اور اُن کے آخر میں دو شعر لکھوائے اتفاقاً اُسی دن عہد مذکور کے تین اُستاد کامل ابن دُرَید۔ ابن انباری۔ اور ابو بکر قاضی ممدوح سے ملنے آئے (کثرت بیان کی وجہ سے بعض لوگ ابو عمرو کی نسبت یہ بدگمانی کرنے لگے تھے کہ وہ بہت سی باتیں طبعزادھی کہدیتے ہیں لہذا) قاضی صاحب نے وہ مسائل عُلمائے موصوف کی خدمت میں پیش کیے اور اُن کی تنقیح چاہی۔ ایک علامۂ وقت کے مسائل پر رائے زنی کرنا پوری ذمہ داری کا کام تھا۔ ابن انباری اور ابو بکر تو اپنے مشاغل کا عذر کرکے خاموش ہورہے۔ ابن دُرَید نے بے ساختہ کہا کہ ان مسائل کی لغت میں کوئی اصل نہیں۔ سب ابو عمرو کے گڑھے ہوئے ہیں

[1] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۰۹ [2] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۳۰۹۔

ابو عمرو کو یہ خبر پہنچی تو قاضی صاحب سے کہلا بھیجا کہ اپنے کتاب خانے میں سے فلاں فلاں شعرائے عرب کے دیوان نکلوا دیجیے۔ چنانچہ وہ سب دیوان نکالے گئے۔ ابو عمرو نے ایک ایک مسائلہ لے کر اُس کے شواہد اُن دیوانوں سے نکال نکال کر قاضی صاحب کو دکھلانے شروع کیے اور اس طرح تیسوں مسائلے اہل زبان کے کلام سے ثابت کر دیے۔ دو شعر جو اخیر میں لکھوا دیئے تھے اُن کی نسبت کہا کہ میرے اُستاد ثعلب نے فلاں روز آپ کے سامنے پڑھے تھے اور آپ نے فلاں کتاب کی پشت پر لکھ لیے ہیں۔ جب وہ کتاب دیکھی گئی تو فی الواقع وہ شعر اُس پر ثبت تھے۔ ابن دُرَید نے اس حال کو سن کر پھر کبھی کوئی لفظ ابو عمرو کی نسبت زبان سے نہیں نکالا[1]۔

متنبی شاعر مشہور سے ابو علی فارسی امام نحو نے ایک بار پوچھا کہ فِعلیٰ کے وزن پر عربی زبان میں کتنے اسم جمع آئے ہیں متنبی نے بے تامل کہا حجلیٰ اور ظربیٰ۔ ابو علی نے تین شب متواتر لغت کی کتابیں چھانیں۔ مگر تیسرا اسم جمع اُن کو اس وزن کا نہ ملا[2]۔

جب حسن ابن سہل وزیر خلیفہ مامون الرشید عراق میں آیا تو اُس نے علمائے ادب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ حسب ایما۔ اصمعی۔ ابو عُبیدہ اور ابو بکر نحوی۔ بارگاہ وزارت میں حاضر ہوئے۔ ان سے مخاطب ہونے سے پیشتر وزیر نے اُن عرائض پر دستخط کیے جو اہل حاجت نے پیش کی تھیں۔ جب ان عرضیوں پر جو شمار میں پچاس تھیں دستخط کر چکا تو علمائے ممدوح کی طرف متوجہ ہو کر معذرت کی اور سلسلۂ کلام شروع کیا۔ اثنائے کلام میں اُن بزرگانِ گزشتہ کا ذکر ہوا جن کی قوّت حافظہ مشہور تھی۔ اور امام زُہری اور قتادہ کا ذکر ہونے لگا ابو عبیدہ نے کہا حدیثِ زندہ گویم مردہ درگور۔ اس وقت یہاں ایسا شخص موجود ہے کہ کبھی

---

[1] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۹۱ [2] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۶

کتاب کو ایک بار پڑھ کر دوبارہ دیکھنے کی اُس کو حاجت نہیں ہوئی۔ اور جو بات ایک دفعہ اُس کے خزانہ حافظہ میں پہنچ گئی پھر نہیں نکلی یہ سُنکر اصمعی نے جسارت کر کے کہا کہ یہ میری طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اُن کے دعوے کو میں اس طرح ثابت کر سکتا ہوں کہ وزارت مآب نے جسقدر عرائض پر اس وقت دستخط فرمائے ہیں اُن سب کا خلاصہ مضمون اور دستخطوں کی اصل عبارت سُنا دوں۔ وزیر کے حکم سے کُل عرضیاں واپس آکر پیش ہوئیں۔ اصمعی نے بیان کرنا شروع کیا کہ فلاں عرضی کے پیش کنندہ کا یہ نام ہے اور یہ کام اور یہ دستخط اُس پر ہوئے اسی طرح وہ نادرہ روزگار بیان کرتا گیا جب کچھ اوپر چالیس عرضیوں کی نوبت پہنچی تو حاضرین میں سے ابو نصر نے کہا کہ اصمعی خدا کے لیے اپنی جان پر رحم کرو کہیں نظر نہ لگ جائے۔ یہ سُنکر وہ چہکتا ہوا بلبل خاموش ہو گیا۔[1]

امام ابو سعد کو ساری صحیح مسلم۔ حافظ ابو الحسین اصفہانی کو صحیح بخاری و صحیح مسلم۔ اور امام تقی الدین بعلبکی کو الجمع بین الصحیحین صحیح مسلم اور اکثر مُسند امام احمد برزبان تھی۔ امام فخر الدین ایک جلسے میں ستر حدیثیں حفظ کر لیتے تھے۔ ایک بار ایک دن سے کم میں اُنھوں نے مقامات حریری کے تین مقامے ازبر کر لیے۔[2] علامہ ابن ابی اصیبعہ مؤلف طبقات الاطبا نے ادویۂ مفردہ کے متعلق کچھ کتابیں مصنفۂ ابن بیطار خود مصنف سے پڑھی تھیں۔ اپنے اُستاد کی تعلیم کا جو اُسلوب اُنھوں نے طبقات میں لکھا ہے اُس سے علاوہ استحضار علمی کے یہ بھی آشکارا ہوتا ہے کہ اساتذۂ سلف کس طرح اپنے تلامذہ کو کامل بناتے تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے اُستاد کے درس کے وقت بہت سی کتابیں مفرد دواؤں کے متعلق مثل کتاب حکیم دیسقوریدس کتاب جالینوس۔ کتاب غافقی موجود رہتی ہیں۔ اُن کے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ اول ایک مفرد دوا

---

[1] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۸۶ [2] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۹۰۔ ۱۱۶۔ ۲۳۱

کا یونانی نام (جو دِیسقوریدس نے لکھا ہی) لیتے اُس کے بعد اُس کے معنی (جو اُنھوں نے رُم میں رہ کر تحقیق کیے تھے) بیان کرتے۔ پھر جو کچھ طبیب مذکور نے اُس دوا کے افعال و خواص لکھے ہیں سُناتے۔ اسی طرح جالینوس اور متاخرین کے اقوال و مذاہب کا بہ ترتیب ذکر کرتے پھر اطبا کے باہمی اختلاف کی (دوائے مذکور کی نسبت) تشریح کرتے۔ آخر میں وہ غلطیاں ظاہر کرتے جو اطبائے مذکور سے اُس دوا کے متعلق سرزد ہوئی تھیں۔ اُستاد جب ان مدارج کو طے کر چکتے تو ہم محوّلہ کتابوں کو کھول کر دیکھتے۔ اُن کے زبانی بیان اور کتابوں کے مضمون میں سرمو فرق نہ نکلتا۔ جب ہم کتاب دیکھتے تو ابن بیطار یہ بتاتے جاتے کہ دِیسقوریدس نے فلاں مقالے میں اس دوا کا ذکر کیا ہی۔ اور مقالۂ مذکور میں اس کا یہ نمبر ہی۔ اس قدر بیان پر علامہ اُستاد کو تسلی نہ ہوتی بلکہ جن نباتات کا ذکر درس میں ہوتا وقتاً فوقتاً جنگل میں لیجا کر اُن کا مشاہدہ بھی طلبہ کو کرا دیتے۔ جو اُستاد اپنے طَلَبہ کے سامنے بُقراط اور جالینوس کی غلطیاں نکال کر رکھ دے اُن کو کتاب کا کیڑا نہ بنائے بلکہ حقائق کے مشاہدے کا خوگر کرے اُسکے شاگرد بے شک کامل و محقق ہوں گے۔ جو لوگ جالینوس اور ارسطو کی عقل کو معصوم مان چکے اُنھوں نے تو گویا اپنی عقلوں کو یونانیوں کے ہات بیچ ڈالا۔ پھر کمال کیسا اور تحققات کجا۔[1]

امام داؤد ظاہری ناقل ہیں کہ میری محفل میں ایک روز ایک شخص ابو یعقوب بصری نامے شکستہ حال وارد ہوئے اور بدون کسی اشارے کے خود بخود صدر میں آ بیٹھے اور فخریہ لہجے میں مجھ سے کہا کہ سَلْ یَا فَتیٰ عَمَّا بَدَا لَکَ (اے جوان تیرے دل میں جو آئے مجھ سے پوچھ لے) مجھ کو اُن کی اس مشیخت پر سخت غصہ آیا اور استہزائیں میں نے کہا کہ حجامت[2] کی نسبت کچھ فرمائیے۔ ابو یعقوب نے بارک اللہ کہا اور سب سے اوّل محدثانہ اور فقیہانہ گفتگو شروع کی

---

[1] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۳۳ [2] پچھنے لگوانا۔

حدیث اَفْطَرَ الْحَاجِمُ وَالْمَحْجُوْمُ کو روایت کر کے بیان کیا کہ کس راوی نے اُس کو مُسند اور کس نے موقوف اور کس نے مرسل روایت کیا ہو۔ اور فقہا میں کس کس کا عمل اس پر ہی۔ اسکے بعد اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پچھنے لگوانے کے مختلف طریقے بیان کیے اور اُس اُجرت کا ذکر کیا جو آپ نے حجام کو مرحمت فرمائی تھی اور یہ ثابت کیا کہ اگر اُجرتِ حجامت حرام ہوتی تو آپ مرحمت نہ فرماتے۔ پھر ایک اور حدیث کے طرق روایت سُنائے جس کا مضمون یہ ہو کہ آنحضرتؐ نے بھری شاخیں کھچوائی تھیں۔ پھر اس باب کی تمام احادیث صحیحہ۔ متوسطہ۔ اور ضعیفہ کو علی الترتیب بیان کیا۔ اُصول حدیث و فقہ کے مطابق اس قدر بحث کے بعد وہ طب کی طرف جُھکے اور اطبا کی جو رائے حجامت کی نسبت مختلف زمانوں میں رہی ہی مشرح کہہ سُنائی۔ طب کے بعد تاریخ کا نمبر تھا آخر کلام میں اُنھوں نے یہ ثابت کیا کہ سب سے اول یہ عمل اصفہان میں ایجاد ہوا تھا۔ امام ظاہری فرماتے ہیں کہ میں یہ وسعت تقریر دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ اور اُن کی طرف مخاطب ہو کر کہا وَاللہِ مَا حَقَرْتُ بَعْدَكَ اَحَدًا اَبَدًا یعنی میں بعد تمھارے کسی کو بہ نظر حقارت نہیں دیکھوں گا[1]۔ مجدالدین فیروزآبادی صاحبِ قاموس نے ایک زمانے میں بیان کیا تھا کہ میں جب تک دو سو سطریں حفظ نہیں کر لیتا سوتا نہیں۔

قرامان واقع مُلک روم میں جو مدرسہ بنام مدرسہ سلسلہ جاری تھا اُس کے بانی کی جانب سے یہ شرط تھی کہ اُس کا مدرس وہ عالم مقرر کیا جائے جس کو صحاح جوہری ازبر ہو۔ چنانچہ مولانا جمال الدین اپنے عہد میں مدرسۂ مذکور کے مدرس تھے[2]۔

علم سے سیر نہ ہونا علامہ ابن العلا سے ایک بار کسی نے پوچھا کہ آدمی کو علم کب تک حاصل کرنا چاہیئے۔ اُس عالی دماغ نے جواب میں کہا کہ مَا دَامَتِ الْحَيٰوةُ

[1] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۱۷۶ [2] شق۔ ج ۱ صفحہ ۳۳۲۔

تحسن بہ یعنی جب تک حیات مہربان رہی۔ دریاے علم ناپیداکنار رہی اور انسانی زندگی محدود
با اینہمہ اگر آدمی کسی حد پر پہنچکر علم سے سیر ہوجائے تو یہ اُس کی حرمان نصیبی ہی۔ شوق کا تقاضا یہ ہے

دست از طلب ندارم تا کام من برآید یا جاں رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

اور یہ محض دل خوش کن خیال نہیں ہی۔ آپ میدان علم میں ایسے جواں مرد پائینگے جنھوں نے
اس قول کو دم واپسیں تک عزیز رکھا اور دکھلا دیا کہ جب اجل کا فرشتہ اُن کی جان شیریں تن
سے جُدا کر رہا تھا وہ علم کی خدمت میں مشغول تھے۔ اور سچ یہ ہی کہ جب علم محدود نہیں تو طلب
کی بھی کوئی حد نہونی چاہیئے۔ کسی کمال کے طالب کا یہ خیال کرلینا کہ میں حد طلب کو پہنچ چکا
سم قاتل ہی۔ یہ مسالہ پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہی کہ عالم میں کسی حالت کو وقوف نہیں ہی۔ یا ترقی
ہی یا تنزل۔ پس علمی عروج میں بھی جس زینے پر طالب کا قدم رکا وہیں سے اُس کا تنزل شروع
ہوجائیگا۔ اور جب تک اُس کے ذہن میں اپنی نادانی کا خیال راسخ اور اُس کی ہمت کا
مقولہ "بیش" رہیگا میدان طلب میں فتح و فیروزی نصیب ہوتی جائیگی۔ سُقراط کا مقولہ ہی کہ
میرے علم کی معراج یہ ہی کہ میں نے سمجھ لیا ہی کہ مجھ کو کچھ نہیں آتا۔ دیار مغرب کا ایک حکیم دانا
جب بستر نزع پر دم توڑ رہا تھا تو اُس نے کہا کہ دنیا میرے علم کی نسبت معلوم نہیں کیا کیا
گمان کر رہی ہوگی۔ مگر میں اپنے آپ کو یہ سمجھتا ہوں کہ ایک نافہم بچہ سمندر کنارے چند خزف
پاروں سے کھیل رہا ہی اور علم کا ناپیداکنار سمندر اُس کے سامنے موج زن ہی۔ بیشک اگر ان
حکما کا یہ دلی عقیدہ نہوتا تو ہرگز وہ علمی مراتب پر سرفراز نہوتے ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست ہرچہ بروے میرسی بروے مایست

امام ابن السنی کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ میرے والد نے ایک ورق لکھتے لکھتے
قلم دوات میں رکھا اور دُعا کو ہات اُٹھائے۔ جو ہات دعا کے واسطے اُٹھے تھے پھر وہ قلم

نہ اُٹھا سکے اور عین حالت دُعا میں روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔ ابن السنی کا سن اُس وقت اسّی برس سے متجاوز ہو چکا تھا[1]۔ حافظ ابن مُندہ کا بیان ہے کہ اُن کے والد جب دُنیا سے رحلت کر رہے تھے تو حافظ ساجی اُن کے سامنے غرائب شعبہ کی قرارت میں مصروف تھے[2]۔ امام ادب ابوالعباس ثعلب کی وفات کے واقعے سے زیادہ مؤثر مثال اس مبحث میں مشکل سے ملے گی۔ ثعلب کی عمر اکانوے برس کی ہو چکی تھی کہ ایک دن جمعے کے بعد مسجد سے مکان کو جانے لگے راستے میں کتاب دیکھتے جاتے تھے۔ کتاب میں محویت اور اُس پر ثقل سماعت پھر آواز کیا سُنتے۔ ایک گھوڑے کا دھکّا لگا اور اُس کے صدمے سے بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ لوگ غشی کی حالت میں اُٹھا کر مکان پر لائے ضعف پیری اتنے بڑے صدمے کو کب برداشت کر سکتا تھا اُسی حال میں رحلت کی۔ انتہاے پیری میں بھی اُنکا شوق طلب اتنا قوی تھا کہ رہ نوردی میں جو وقت گزرتا اُس کا جاتا رہنا بھی گوارا نہ ہوا ؎

چہ حالت ست ندانم جمال سلما را   کہ بیش دیدنش افزوں کند تمنا را

اور سچ یہ ہے کہ اگر یہ علمی تشنگی نہ ہوتی تو ابوالعباس ادب میں امامت کے درجے کو نہ پہنچتے[3]۔

انسان جب کسی پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے تو اُس سے معمولی کام بھی نہیں ہو سکتے لیکن طلب صادق میں یہ کرامات ہے کہ وہ پریشانی کو بھی جمعیت کے قالب میں لے آتی ہے۔ علماے سلف نے پریشاں خاطری کی حالت میں وہ وہ کام کیے ہیں کہ زمانہ آج تک اُن پر آفریں کر رہا ہے۔ ابو تمّام طائی شاعر مشہور ایک مرتبہ خراسان کے دربار کو جا رہا تھا۔ ہمدان پہنچکر موسم سرد مہری سے پیش آیا اور برف اس کثرت سے پڑی کہ تمام راستے بند ہو گئے اور ابو تمام کو چندے وہیں قیام کرنا پڑا۔ حالت سفر میں ایسا حرج واقع ہونے سے جو پریشانی طبیعت کو

---

[1] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۵۱   [2] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۴۴   [3] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۰

ہوتی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ مگر ہمارے زندہ دل شاعر کی خاطر جمع تھی جس رئیس کا وہ مہمان تھا اُس کے کتاب خانے میں دواوین عرب بکثرت تھے ابو تمّام نے موقع کو غنیمت سمجھکر سب دیوان پڑھے اور اُن میں سے اشعار انتخاب کر کے نظم عربی کا ایک بے بہا مجموعہ تیار کرلیا جو آج تک حماسہ کے نام سے سارے عالم میں مشہور ہے۔ شیخ الرئیس سے ایک زمانے میں حکام وقت برہم تھے اور جان کے خوف نے اُس کو روپوش کر رکھا تھا اسی تباہ حالی میں کچھ دن کے لیے اُسے ایک عطار کے گھر میں پناہ مل گئی اتنا سا اطمینان پاکر شیخ کو اپنے علمی مشاغل یاد آئے اور عطار سے سامان تحریر منگوا کر تصنیف شروع کر دی۔ یہ کوئی معمولی تصنیف نہ تھی بلکہ شیخ اپنی کتاب شفا کو تمام کر رہا تھا۔ طرز تصنیف یہ تھا کہ اول رُوس مسائل اپنی یاد سے ایک جزو پر لکھے اُس کے بعد اُن مسائل کی تشریح کی۔ اس طرح فن طبعیات والہیات ختم کر دیے فنون حکمیّہ میں کتاب حیوان و کتاب نباتات اگرچہ باقی تھی لیکن شیخ اُن کو چھوڑ کر فن منطق لکھنے لگا۔ ہنوز منطق تحریر ہو رہی تھی کہ قضیّہ دگرگوں ہو گیا۔ کسی مخبر نے حاکم کو خبر کر دی اور اُس نے شیخ کو گرفتار کر کے قلعۂ فردجان میں بھیجدیا۔ اُس بلند و استوار حصار میں شیخ کا جسم بے شک مقید تھا لیکن اُس کے علمی شوق کو کوئی دنیاوی طاقت مقید نہیں کر سکتی تھی۔ اُسی زندان میں کتاب الہدایات رسالہ حی ابن یقظان۔ اور کتاب القولنج تصنیف کر ڈالیں۔ اس وقت کے لوگ اگلے زمانے کو ایک بہشتی زمانہ تصور کر رہے ہیں جس میں علما کے واسطے در و دیوار اور زمین و آسمان سے اطمینان و فارغ البالی برستی تھی۔ اور اُن کا یہ گمان بلکہ بدگمانی ہے کہ جو نمایاں کام اسلاف نے کیے وہ اسی فراغ خاطر کی بدولت تھے۔ حالانکہ واقعات اس کی تردید کر رہے ہیں۔ کیا حکایت بالا کو پڑھ کر کسی دلمیں یہ تمنا پیدا ہو گی

[1] ابن۔ ج ا۔ صفحہ ۲۶۱

کہ کاش اُس کو شیخ الرئیس کا سا اطمینان نصیب ہوتا۔ اگر شیخ نجات اور فراغ خاطر کا منتظر رہتا تو دنیا کو شفا وغیرہ بے بہا تصانیف کب میسر آتیں[۱]۔ شیخ ابن جوزی ایک زمانے میں واسط میں نظر بند تھے یہ وہ وقت تھا کہ چار دانگ عالم کو اُن کی امامت وجلالت مسخر کر چکی تھی حُسن اتفاق سے ابن باقلانی بھی اُن روزوں واسط میں تھے۔ ابن جوزی نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور اُن سے پڑھنا شروع کر دیا۔ شیخ کے صاحبزادے یوسف باپ کے ہم سبق تھے۔ اس واقعے کی جان یہ ہے کہ سبق خوانی کے وقت امام ابن جوزی کی عمر اسّی برس کی تھی[۲]۔ شمس الائمہ سرخسی نے جو کتاب علم اصول میں تصنیف کی ہی اُس کا لکھنا خوارزم کے قیدخانے میں شروع کیا تھا باب الشروط تک حالت قید میں لکھی۔ رہائی پاکر فرغانہ میں ختم کی[۳]۔

علامہ اثیر الدین ابہری کی نسبت بیان ہی کہ اگرچہ علم وفضل میں اس پایہ کو پہنچ گئے تھے کہ خود اُن کی تصانیف ملک میں مقبولیت حاصل کر چکی تھیں۔ تاہم اساتذہ کے سامنے کتاب لے کر بیٹھنے میں اُن کو عار نہ تھی۔ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ خود میں نے اُن کو اس حالت کمال میں کمال الدین شافعی سے مجسطی پڑہتے دیکھا تھا[۴]۔ امام داؤد ظاہری کی مجلس میں چارسو عالم صاحب طیلسان حاضر ہوتے تھے۔ اور شیخ ابو حامد اسفرائنی کے درس میں تین سو تک فقہا شمار کیے گئے[۵]۔

امام نحو یونس نے اٹھاسی برس کی عمر پائی۔ ابن خلکان اُن کی نسبت لکھتے ہیں کہ ساری عمر انھوں نے شادی نہیں کی اور مرتے دم تک اُن کے پیش نظر سوا طلب علم اور مذاکرۂ علمیہ کے کچھ نہیں رہا[۶]۔

بذل اموال افلاس کی حالت میں علمائے کرام کی ہمّت کا جو عالم رہا اُس کو ہم مفصّل

[۱] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۶ [۲] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۱۴۰ [۳] کشف الظنون۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۱۴
[۴] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۳۳ [۵] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۹ و ۱۷۶ [۶] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۴۱۶

گزارش کر چکے ایک دوسرا پہلو دیکھنا ابھی باقی ہے یعنی دولت و تمول کا (جسکی نسبت مشہور ہے
بادہا خوردن و ہشیار نشستن سہل است   چوں بدولت برسی مست نگردی مردی)
اثر اُن کے علمی شوق پر کیا پڑا۔ افلاس انسان کے حوصلے کو پست کرتا ہوا اور دولتمندی قوائے
دماغی کو کند اور سُست کرنے والی ہی جس طرح افلاس میں مستقل مزاج رہنا دشوار ہی اُسی
طرح نشۂ دولت میں اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا مشکل ہی۔ اگر واقعات یہ ثابت کردیں کہ علمائے
سلف ثروت میں بھی ویسے ہی طالب علم تھے جیسے افلاس میں تو یہ کہا جائے گا کہ اُنھوں نے
علم کے دو زبردست دشمنوں کو اپنی مردانہ ہمت سے زیر کرلیا تھا۔ علی ابن عاصم بیان کرتے
ہیں کہ ابتدائے طالب علمی میں میرے والد نے ایک لاکھ درہم مجھ کو دیے اور کہا کہ بیٹا
یہ لاکھ درہم لو اور علم کی تحصیل میں صرف کرو۔ مگر یہ یاد رہے کہ ان لاکھ درہموں کا معاوضہ
ایک لاکھ حدیثوں سے ہوگا۔ علی ابن عاصم نے باپ کی توقع کو ضائع نہیں کیا۔ اُن کے
محدثانہ کمال کا یہ شاہد عدل ہی کہ اُن کو دربار علم سے مُسند عراق کا خطاب عطا کیا گیا[1] ہشام
ابن عبید اللہ نے (جو شوقِ طلب میں سترہ سو شیوخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے) سات
لاکھ درہم راہ طلب میں صرف کیے۔ اسی طرح ابن متوکل بخاری نے اسی ہزار درہم حافظ
کبیر ابن سنجر نے نو ہزار اشرفیاں۔ حافظ ابن رستم نے تین لاکھ درہم۔ اور امام ذہبی نے
ڈیڑھ لاکھ درہم طلب علم میں صرف کیے[2]۔

ابوبکر جوزقی کی نسبت روایت ہی کہ انھوں نے طالب علمی میں ایک لاکھ درہم خرچ
کیے اور جس فن کو اتنا گراں خریدا اُس کو کبھی سستا نہیں بیچا یعنی اس کے ذریعے سے کبھی دنیا
نہیں کمائی[3]۔ ابو یوسف سدوسی حافظ علامہ جن کی مسند کبیر فن حدیث میں ایک گراں مایہ کتاب ہے

[1] تذ۔ ج ا صفحہ ۲۸۹ [2] تذ۔ ج ا صفحہ ۲۵۵ = ج ۲ صفحہ ۱۵۶ و ۱۷۴ و ۱۴۱ [3] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۲۱۹

بہت متمول اور با ثروت تھے چالیس کاتب ان کی سرکار میں شب و روز کتابوں کی نقل کے واسطے حاضر رہتے۔ اگلے علما جس حوصلے اور ہمت سے کتابیں تصنیف کرتے تھے وہ اِس سے عیاں ہی کہ جس مُسند کو کبیر کا خطاب ملا ہی اُس کی تیاری اور تکمیل میں دس ہزار اشرفیاں صرف ہوئی تھیں[1]۔ ابو مسلم صاحب سُنَن نے اول مرتبہ روایت حدیث کرنے کی خوشی میں دس ہزار درہم خیرات کیے۔ فاروق خطابی اُن کے ایک شاگرد راوی ہیں کہ جب ہم لوگ ان سے سُنَن سُنکر فارغ ہوئے تو ہماری ضیافت اُنھوں نے بڑی دھوم سے کی جس میں ایکہزار اشرفیاں خرچ ہوئیں[2]۔ اسی طرح جب ابن احمد ہمدانی نے پہلی بار اپنے وطن ہمدان میں املای حدیث کیا تو سات سو اشرفیاں طُلبا سے حدیث کی نذر کیں[3]۔ شاہ عبد العزیز صاحب حافظ ابن حجر عسقلانی کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں کہ جب حافظ ممدوح بخاری کی شرح فتح الباری کی تصنیف سے فارغ ہوئے تو اس مسرت میں اُنھوں نے ایک شاندار دعوت[4] پانسو اشرفی لگا کر کی[5]۔ دار قطنی کے اُستاد امام دعلج کی سرکار سے محدثین مکہ مکرمہ و عراق و سجستان کے وظائف مقرر تھے[6]۔ امام لیث حافظ ابو عبد اللہ رازی ایک دفعہ بصرے گئے تو صرف کاتبین کی اُجرت کی بابت دس ہزار درہم ادا کیے[7]۔

مسلمانان سلف میں عموماً علمی ذوق

علمائے سلف کی علمی شیفتگی سے بحث کرنے کے بعد غالباً ایک نظر اُس زمانے کے عام اہل اسلام کی علمی حالت پر ڈالنا خالی از دلچسپی نہوگا۔ اس دورِ شائستگی میں جس طرح ہر شائستہ ملک و ملت کے فی صدی تعلیم یافتہ آدمیوں کی صحیح تعداد آئینہ ہو رہی ہی اُس طرح ہم اگلے زمانے

---

[1] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۵۵ [2] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۹۵ [3] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۹۴ [4] بُستان۔ صفحہ ۱۲۸

[5] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۹ [6] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۱۶

کے خواندہ مسلمانوں کا ٹھیک شمار پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ مگر بہت سے واقعے کتابوں میں ایسے ملتے ہیں جن کی مدد سے قیاس اپنا کام کرسکتا ہے۔ اور ایک تخمینی حالت پچھلے مسلمانوں کے بکثرت تعلیم یافتہ ہونے کی ہمارے ذہن میں پیدا ہوسکتی ہے۔ اس مبحث کو ہم تین حصوں پر تقسیم کرتے ہیں۔ عامۂ مسلمین میں علم کا شوق اور رواج۔ بیبیوں میں علم کا چرچا۔ اُمرا میں علم۔

عامۂ مسلمین میں علم کا شوق اور رواج

عامۂ اہل اسلام میں علمی رواج و مذاق کا پتہ لگانے کے تین ذریعے ہمارے پیش نظر ہیں۔ اولاً ان حاضرین کی تعداد جو ایک ایک حلقۂ درس میں شامل اور حاضر ہوتے تھے۔ ثانیاً اُن اہل کمال کا شمار جو ایک ایک شہر میں تھے۔ ثالثاً چند متفرق حکائتیں۔

یحییٰ ابن جعفر بیکندی بیان کرتے ہیں کہ علی ابن عاصم کے حلقۂ درس حدیث میں تیس تیس ہزار آدمی جمع ہوتے تھے۔ یزید بن ہارون نے جب بغداد میں درس حدیث دیا تو اُس میں ستر ہزار حاضرین کا تخمینہ کیا گیا۔ ایک مرتبہ سلیمان ابن حرب کے واسطے بغداد میں قصر خلافت کے قریب ایک مرتفع جگہ مثل منبر طیار کی گئی تاکہ اُس پر بیٹھکر املاے حدیث کریں۔ اُس مجلس میں امیر المومنین مامون الرشید اور تمام امراے خلافت حاضر تھے جو لفظ امام ممدوح کے مُونھ سے نکلتا اُس کو امیر المومنین اپنے قلم سے لکھتے جاتے۔ جب کُل حاضرین درس کا تخمینہ کیا گیا تو چالیس ہزار نفوس اندازمیں آئے۔ امام عاصم ابن علی املاے حدیث کیواسطے بغداد سے باہر نخلستان میں۔ ایک بلند چبوترے پر بیٹھتے تھے اُن کے مستملے ہارون نے اپنے کھڑے ہونے کے واسطے ایک خمدار کھجور کا درخت پسند کر رکھا تھا۔ خلیفہ معتصم باللہ نے ایکبار ایک اپنا معتمد اُس مجلس کے شرکا کا اندازہ کرنے کے لیے بھیجا۔ معتمد نے ارشاد خلافت کی تعمیل کی تو ایک لاکھ بیس ہزار پر حاضرین کی تعداد پہنچی۔ جس قوم کے افراد ایک ایک مجلس علمی

میں سوا سوا لاکھ جمع ہو جائیں قیاس کیجیے کہ اُس قوم کے سینے میں کتنا شوق علم بھڑک رہا ہوگا۔
اور جو شہر اپنے سوا سوا لاکھ باشندے ایک جلسۂ علمی میں بھیجدے وہ کتنا آباد ہوگا۔[1]

یہ واقعات پڑھنے کے بعد یہ سوال دل میں پیدا ہوتا ہی کہ ایا ان مجالس کے حاضرین کے شمار کرنے کا کیا طریقہ تھا۔ اور حقیقۃً ان روایتوں پر وثوق اس طریقے کی صحت و عدم صحت پر موقوف ہی۔ ذیل کا واقعہ اس سوال کا جواب دیگا۔ احمد بن جعفر راوی ہیں کہ جب ابو مسلم بغداد میں آئے تو رحبۂ غسان نامے مقام پر اُنھوں نے حدیث کا املا کیا۔ سات مستملی کھڑے ہوئے جن میں سے ایک دوسرے کو شیخ کی روایت پہنچاتا تھا اور لوگ کھڑے کھڑے تحریر حدیث میں مصروف تھے یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ کس قدر آدمی اُس وسیع میدان میں فراہم تھے میدان مذکور کی پیمایش کی گئی اور دواتیں گنی گئیں کچھ اوپر چالیس ہزار دواتیں شمار ہوئیں جو لوگ لکھتے نہ تھے صرف سماعاً شریک تھے وہ اس تعداد سے خارج ہیں۔ جب شیخ وقت فریابی نے بغداد میں املاے حدیث کیا تو تین سو سولہ مستملے اُن کی مجلس میں حاضر تھے۔ اور حاضرین تخمیناً تیس ہزار۔ ابو الفضل راوی ہیں کہ جب میں نے فریابی سے حدیث سُنی ہی تو قریباً دس ہزار آدمی اُن کے پاس ایسے پڑھنے آتے تھے جو دوات قلم لے کر بیٹھتے۔ امام ذہبی ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں کہ تیسری صدی ہجری میں یہ شوق اپنے رسول پاک کے اقوال و احوال کا اہلِ اسلام میں تھا کہ ایک ایک مجلس میں دس دس ہزار دواتیں رکھی جاتی تھیں[2]۔ امام بخاری کے صرف ایک شاگرد فربری سے نوے ہزار آدمیوں نے صحیح بخاری کی اجازت حاصل کی تھی[3]۔ جب فرا نے اپنی تصنیف کتاب المعانی (فن ادب) کا املا کیا تو لوگوں نے حاضرین کا شمار کرنا چاہا مگر بوجہ ہجوم کے نکر سکے۔ صرف قاضیوں کو گنا تو اسی تھے[4]۔ دوسرا ذریعہ عامۂ

[1] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۲۹۰-۲۹۱-۳۶۰-۳۶۴ [2] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۱۹۶-۲۶۲-۲۱۰ [3] مقدمہ صفحہ ۵۰۰ [4] ابن۔ ج ۲ صفحہ ۲۲۸

مسلمین میں علم کی کثرت دریافت کرنے کا اُن باکمالوں کی تعداد ہی جو ایک ایک شہر میں ایک ہی وقت میں موجود تھے۔ جب اس بات پر لحاظ کیا جائے کہ فی صدی کتنے طلبہ اعلیٰ تعلیم تک پہنچتے ہیں۔ اور پھر اعلیٰ تعلیم تک پہونچنے والوں میں کتنے ایسے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو علم وفن کی خدمت کے لیے وقف کرکے کمال حاصل کرتے ہیں تو بے شک باکمالوں کی تعداد مسلمانوں میں علم کے عام اور شائع ہونے کی شہادت بن سکیگی۔ ذیل کے واقعے صرف ایک ایک فن کے کملا بتلاتے ہیں۔ مگر قیاس کی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں کہ جس شہر میں نوسو سے زیادہ سند یافتہ طبیب ہوں گے اُس میں کتنے محدث ہوں گے کس قدر ادیب اور کتنے مہندس و وغیر ذالک پس اولاً ذہن میں کل فن کے باکمالوں کی تعداد ایک فن کے باکمالوں پر قیاس کرکے قائم کیجیے پھر یہ سوچیے کہ کتنے پڑھنے والوں میں ایک باکمال پیدا ہوتا ہی تو عامۂ مسلمین میں کثرت تعلیم کا ایک اجمالی مفہوم ضرور آپ کے ذہن میں قائم ہو سکے گا۔

مسلم ابن ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے آٹھ سو شیوخ سے فن حدیث حاصل کیا ہی اور باوجود شیوخ کی اس کثرت کے میں پُل اُتر کر نہیں گیا۔ یعنی ایک ہی شہر میں آٹھ سو اساتذۂ حدیث اُن کو ایسے مل گئے جو شیخ کا لقب حاصل کرچکے تھے[1] ۳۱۹ھ میں خلیفہ عباسی مقتدر باللہ کو یہ سُنکر سخت افسوس ہوا کہ شہر بغداد میں ایک شخص کی جان کسی طبیب کے جہل مرکب کی نذر ہوگئی۔ آیندہ کی انسداد کے لیے رئیس الاطبا ابن ثابت کے نام یہ حکم صادر کیا گیا کہ تمام اطبائے بغداد کا امتحان لیا جائے جو امتحان میں کامیاب ہوں اُن کو سند عطا ہو اور جو ناکامیاب رہیں اُن کو علاج سے روک دیا جائے۔ بغرض مزید احتیاط سند میں اس امر کی تشریح بھی ہو کہ دارندۂ سند کو فلاں فلاں قسم کے امراض کے معالجے کی اجازت ہی تاکہ وہ انھیں امراض کا

[1] غالباً بغداد کا پل جو دجلے پر تھا ۱۲ تذ۔ ج ۱ صفحہ ۳۶۱۔

علاج کر سکے جسنے اُس کو پوری واقفیت ہو۔ ابن ثابت نے فرمانِ خلافت کی تعمیل کی اور کُل اطبائے دار الاسلام کا امتحان لیا۔ کیا یہ حیرت خیز بات نہیں ہی کہ بعد امتحان دار الخلافہ کے دونوں حصّوں میں جن اطبا کو سندِ علاج عطا ہوئی اُن کی تعداد کچھ کم نو سو تھی۔ مزید براں وہ اطبا اس شمار سے خارج ہیں جو بوجہ شہرتِ فضل و کمال امتحان سے مستثنیٰ رہے یا جن کو سرکارِ خلافت میں تعلق حاصل تھا۔ خدا کو علم ہی کہ ایسے طبیب کتنے تھے اور اُن کی تعداد نوسو کے عدد کو کہاں تک بڑھا دیتی[1]۔ امام ادب نضر بن شمیل جب بصرے سے خراسان کو جانے لگے تو تین ہزار آدمی شہر سے اُن کی مشایعت کو ایسے نکلے جو یا نحوی تھے یا لغوی عروضی تھے یا محدث یا اخباری[2]۔

کیا ہم انھیں اسلاف کے خلف ہیں جن میں کمال کی یہ کثرت تھی۔ ہماری پست حالت تو اِن واقعات کو بھی رستم و اسفندیار کے افسانوں کے پہلو بہ پہلو بٹھانے پر آمادہ ہی۔ جیسے تین ہزار اہل بصیرت ایک شہر بصرے سے باہر آئے تھے ویسے تین بھی آج تمام دُنیائے مسلمین میں یقیناً نہیں نکلیں گے۔ جس قوم میں یہ قحط رجال ہو اُس کے اگلے شہروں کی یہ مردم خیزی محال تو بے شک نہیں مگر بعید از حال و خیال تو ضرور ہی۔

تیسرا ذریعہ یہ متفرق واقعے ہیں جن سے ایک ایک پہلو سے ہمارا مدعا عیاں ہوتا ہی۔ ابن الاعرابی کوفی نے ایک روز اپنے درس میں دو آدمیوں سے جو کہ باہم باتیں کر رہے تھے اُن کا وطن دریافت کیا۔ ذرا غور سے سُنیئے کہ ایک نے اپنا وطن اسپیجاب (متصل سرحد چین) بتلایا۔ دوسرے نے اسپین۔ ابن الاعرابی کو اس خیال سے بہت حیرت ہوئی کہ کس قدر دُور دُور دراز ملک کے باشندوں کو شوق علم کی کشش اُن کی مجلس میں کھینچ لائی تھی[3]۔ امام ابو العباس نے

---

[1] عیون۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۲۲ [2] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۶۱ [3] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۴۹۳

ایام طالب علمی میں اپنی والدہ سے اجازت چاہی کہ امام قتیبہ کی خدمت میں حاضر ہو کر فیضیاب ہوں مگر اجازت نہ ملی اور اُنھوں نے عزم فسخ کر دیا۔ جب اُن کی والدہ رحلت فرما گئیں تو بلخ پہنچے۔ قتیبہ اُن کے پہنچنے سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ کسی جلیل القدر اُستاد کے فیض سے محروم رہ جانا اُن دنوں دُنیائے اسلام میں ایک ایسی مصیبتِ عُظمیٰ سمجھی جاتی تھی کہ لوگ ابوالعباس کے پاس اُن کی محرومی کی تعزیت کرنے آتے تھے[1]۔ حافظ کبیر ابونعیم کی کتاب الحلیہ کا پہلا نسخہ جب نیشاپور پہنچا تو وہاں اُس کی یہ قدر ہوئی کہ چار سو اشرفی کو بکا[2]۔ علامہ محدث ابن فطیس قرطبی کی کتابیں اُن کی وفات کے بعد بیچی گئیں تو چالیس ہزار اشرفیوں میں فروخت ہوئیں[3]۔

بیبیوں میں علم کا ذوق

جن کتابوں کی مدد سے ہم نے یہ اوراق مرتب کیے ہیں وہ عورتوں کی تعلیمی حالات سے اور بھی خاموش ہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے کچھ واقعات متفرق ایسے ملے ہیں جو صاف کہہ رہے ہیں کہ ہماری ترقی کے دَور میں انسانی صنفِ نازک بھی ایک علمی شان و مرتبہ رکھتا تھا اور جو کمالات اگلے مسلمان حاصل کرتے تھے اُن میں اُن کی ماؤں اور بہنوں کی مدد غیر مُعتدبہ نہیں ہوتی تھی۔ امام حافظ ابن عساکر مؤرخ دِمشق نے جن اساتذہ سے فن حدیث حاصل کیا تھا اُن میں اسی سے زیادہ عورتیں تھیں[4]۔ حافظ ابن حجر توالی التاسیس میں اپنے شیوخ میں متعدد جگہ بیبیوں کا نام لیتے ہیں۔ حفیدا ابن زہر اشبیلیہ کے طبیب مشہور کی بہن اور بھانجی طب و معالجات کی عالمہ تھیں اور امراض النسائی کے معالجے میں بالخصوص اُن کو مہارت تامہ حاصل تھی۔ خلیفہ منصور (فرمانروائے اُندلس) کے محلات کا علاج اُن کے سپرد تھا۔ اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جیسے

[1] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۱۳ [2] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۲۹۳ [3] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۶۲ [4] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۱۲۳

عموماً گھر کی بڑی بوڑھیاں عورتوں اور بچوں کے علاج کرلیا کرتی ہیں ایسی ہی ابن زہر کی بہن اور بھانجی بھی ہوں گی۔ مؤرخ ابن ابی اصیبعہ جو علاوہ علامۂ وقت ہونے کے اعلیٰ درجہ کے طبیب بھی تھے اپنی تاریخ میں ان کی نسبت یہ الفاظ لکھتے ہیں۔ وَکَانَتْ اُخْتُہٗ وَاَبْنَتُھَا ھٰذِہٖ عَالِمَتَیْنِ بِصِنَاعَۃِ الطِّبِّ وَالْمُدَاوَاۃِ وَلَھُمَا خِبْرَۃٌ جَیِّدَۃٌ بِمَا یَتَعَلَّقُ بِمُدَاوَاۃِ النِّسَاءِ[۱] یعنی اُس کی (ابن زہر کی) بہن اور بھانجی فن طب و معالجات کی عالمہ تھیں اور مستورات کے علاج میں یدطولی رکھتی تھیں۔ امام یزید ابن ہارون کو آخر عمر میں ضعف بصارت نے کتاب بینی سے معذور کردیا تھا۔ اُن کی جاریہ اِس مصیبت میں اُن کے کام آئی اور وقت ضرورت کتابیں دیکھکر اُن کے لیے حدیثیں یاد کرلیتی[۲] ابن سماک کوفی نے (جو اپنے عہد میں مشہور عالم تھے) ایک مرتبہ تقریر کرنے کے بعد اپنی جاریہ سے پوچھا کہ میرا طرز بیان کیسا ہی۔ سخن شناس جاریہ نے کہا کہ تقریر تو اچھی ہی لیکن اتنا نقص ہو کہ تم ایک ہی بات کو باربار کہتے ہو۔ ابن سماک ”میں اعادۂ کلام اس لیے کرتا ہوں کہ جو مخاطب اول مرتبہ نہ سمجھے ہوں وہ بھی سمجھ جائیں“ جاریہ ”جب تک کم فہم سمجھیں گے۔ سمجھنے والے مکدر ہوچکیں گے“[۳] امام ابن جوزی کو اُنکے والدین برس کا چھوڑکر رحلت کرگئے تھے۔ باپ کے بعد یتیم بچے کی پرورش کی کفیل پھوپھی ہوئیں۔ ابن جوزی کی بہت چھوٹی عمر تھی کہ اُن کی پھوپھی اُن کو علما کے حلقہ درس میں لیجاتیں تاکہ بچپن ہی سے اُن کے کان علمی باتوں سے آشنا ہوجائیں اس حفظ اوقات کا یہ نتیجہ ہوا کہ ابن جوزی دس برس کی عمر میں وعظ فرمانے لگے اور بڑہ کر دنیا کے ایک جلیل القدر امام ہوئے[۴] امام ربیعۃ الرائے (اُستاد امام مالک و خواجہ حسن بصری) کے والد فروخ خلافت بنی اُمیہ کے عہد میں لشکر میں ملازم تھے جس زمانے میں امام ممدوح اپنی والدہ کے بطن میں تھے اُسوقت

[۱] عیون۔ ج ۲ صفحہ ۷۰ [۲] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۲۹۲ [۳] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۴۹۱ [۴] تذ۔ ج ۴ صفحہ ۱۳۱

خراسان کو ایک لشکر خلیفۂ دمشق کی جانب سے روانہ کیا گیا۔ اور فروخ کی خدمت اس لشکر کے سپرد ہوئی۔ وہ دَور اسلامی فتوحات کا دَور تھا اور مسلمان فرمانروا بر و بحر کو اسلامی پرچم کے نیچے لانے کا تہیّہ کر رہے تھے فروخ کو خراسانی مہم میں ستائیس برس لگ گئے۔ جب وہ لَوٹے تو جس بچے کو ماں کے پیٹ میں چھوڑ گئے تھے وہ بڑا ہو کر امام وقت بن چکا تھا قصّہ مختصر فروخ لوٹ کر اپنے وطن مدینۂ منورہ کو آئے اور گھوڑے پر سوار نیزہ ہات میں لیے گھر پہنچے اور دروازے کو نیزے کی انی سے کھٹ کھٹایا۔ ربیعہ نے جو کھٹکا سُنا تو دروازہ کھولا اور باہر آئے۔ اگرچہ .... باپ نے بیٹے کو نہیں پہچانا مگر گھر اُن کا تھا۔ دروازہ کھلنے پر بے تکلف اندر جانے لگے۔ ربیعہ کو یہ دیکھکر وحشت ہوئی اور للکار کر کہا کہ یَا عَدُوَّ اللّٰہِ تو میرے مکان میں کس طرح گھسا پڑتا ہی۔ سپاہی منش فروخ کو جن کی رگوں میں فتح کا جوش تازہ تھا یہ سُنکر طیش آیا اور کہا کہ خدا کے دشمن میری حرم سرا میں تیرا کیا کام۔ غرض بات بڑھی اور خدائی چیخ پڑوسی جمع ہو گئے امام مالک بھی اُستاد کا معاملہ سمجھکر تشریف لے آئے اور مصلحانہ لہجے میں فروخ سے کہا کہ بڑے میاں آپ کو ٹھہرنا ہی مقصود ہی۔ تو دوسرا مکان موجود ہی۔ امام صاحب کی نرمی نے فروخ کے دل پر اثر کیا اور کہا کہ جناب میرا نام فروخ ہی اور یہ مکان میرا ہی۔ ربیعہ کی والدہ نے نام سُنکر پہچانا اور کہا کہ یہ تو ربیعہ کے باپ ہیں۔ اب تو باپ بیٹے گلے ملے اور رل کر خوب روئے۔ دلوں کی حرارت جب رونے سے کم ہوئی تو دونوں گھر میں آئے اور اندر آکر پھر جوش محبت میں صاف دل باپ نے بی بی سے پوچھا کہ یہ میرا ہی بیٹا ہی۔ انھوں نے کہا ہاں۔ فروخ جب اطمینان سے بیٹھ لیئے تو اُن کو وہ تیس ہزار اشرفیاں یاد آئیں جو چلتے وقت بی بی کو دے گئے تھے۔ اور اُن کی نسبت استفسار کیا۔ زیرک بی بی نے کہا کہ گھبرایے نہیں۔ حفاظت سے رکھی ہیں۔ ربیعۃ الرائے اس عرصے میں مسجد نبوی میں جاکر

اپنے حلقۂ درس میں متمکن ہوے جس میں امام مالک اور خواجہ حسن بصری سے اعیان شامل تھے
تلامذہ کا یہ ہجوم تھا کہ چاروں طرف سے شیخ کو گھیرے ہوئے تھے۔ فروخ جو نماز پڑھنے مسجد
میں گئے تو وہاں یہ عالم دیکھا اور دیر تک شوق سے اس مجمع کو دیکھتے رہے۔ ربیعہ اُسوقت
سر جھکاے ہوئے تھے اور سر پر اونچی ٹوپی تھی۔ اس لیے باپ کو ایک دفعہ پھر بیٹے کے
پہچاننے میں دقت ہوئی اور اُنھوں نے متعجب ہوکر لوگوں سے پوچھا کہ یہ شیخ کون ہی سامعین
نے جواب دیا ربیعہ ابن عبدالرحمن۔ فروخ کے اُسوقت کی مسرت کا اندازہ سوالے عالم الغیب
کے کون کرسکتا ہی۔ فرط مسرت میں اُن کی زبان سے بے اختیار نکلا لَقَدۡ رَفَعَ اللّٰہُ اِبۡنِیۡ۔
جب خوش خوش گھر آئے تو بی بی سے سارا ماجرا بیان کیا۔ بی بی نے کہا کہ آپ کو کیا زیادہ
پسند ہی بیٹے کی یہ شان یا تیس ہزار اشرفیاں۔ شوہر نے کہا کہ واللہ میں اس شان کو زیادہ
پسند کرتا ہوں۔ بی بی۔ میں نے وہ اشرفیاں ربیعہ کی تعلیم میں صرف کردیں۔ زندہ دل شوہر
وَاللّٰہِ مَا ضَیَّعۡتِیۡہِ (قسم رب کی تم نے وہ مال ضائع نہیں کیا) اس واقعے میں یہ امر قابل غور
ہی کہ ایک بچہ باپ کی تربیت سے محروم ہوکر ماں کی حفاظت میں رہے اور ماں کے قبضے میں
تیس ہزار اشرفیاں ہوں۔ پھر اُس بچے کو ایسی بیش بہا تعلیم دیجاسے کہ اُس کے شاگرد دنیا کے
نامور امام ہوں۔ بے شک یہ اُس عہد کی عورتوں کے عقیل اور علم دوست ہونے کی دلیل ہی
ہمارے ملک میں اگر چودھویں صدی کی کسی ماں کے اختیار میں تیس ہزار اشرفیاں اور ایک
بچہ دے دیا جاے تو معلوم نہیں بلند اقبال صاحبزادے کے اخلاق کہاںتک ترقی کریں[۱] عربی
کی ریاضیات میں شرح چغمینی جس پائے کی کتاب ہی اُس سے ہر اک مشرقی طالب علم واقف ہی
لیکن یہ بات بہت کم معلوم ہوگی کہ اگر قاضی زادہ رومی کی خواہر اپنے بھائی کی مدد نہ کرتیں تو

---

[۱] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۱۸۳۔

ہمارے کتاب خانے اس مشہور کتاب سے محروم رہتے۔ شارح حنیفی نے ابتدائے علوم کی تحصیل اپنے وطن روم میں کی تھی۔ جب اساتذۂ عجم کے کمال کا شہرہ اُنھوں نے سُنا تو خراسان کا شوق دل میں پیدا ہوا۔ اور چُپکے چُپکے سامان سفر کرنے لگے۔ بہن زیرکی سے بھائی کے ارادے کو پاگئیں اور بجائے اس کے کہ رو بیٹھ کر گھر بھر کو خبردار کر دیتیں۔ اپنا بہت سا زیور بھائی کے سامان سفر میں چھپا چھپا کر رکھدیا تاکہ مسافرت میں خرچ کی طرف سے پریشانی نہو۔ بہن کے اس عزیز توشے نے جو نفع دیا ہوگا اس کا اندازہ علامہ بھائی کے دل سے کوئی پوچھتا[1]۔ ہم نے اوپر بیان کیا ہی کہ امام بخاری نے جب چودہ برس کے سِن میں علم حاصل کرنے کے لیے سفر کرنا شروع کیا تھا۔ تو اُن کی والدہ اور خواہر نگرانی کی متکفل تھیں۔

اُمرا میں علم کا ذوق

ہم اس عنوان میں صرف دو تین مثالیں بیان کریں گے۔ مثالوں کی قلت کسی ذہن میں واقعات کی قلت کا شبہ نہ پیدا کرے ابتدائی ہجری صدیوں میں مسلمان اُمرا عالم ہونے کی حیثیت سے علما کے پہلو بہ پہلو رہے ہیں۔ بنی موسیٰ اور سیف الدولہ کے فضل و کمال سے کون واقف نہیں۔ مگر چونکہ ہم دوسری وادی میں ہیں اس لیے انھیں مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ اُستاد ابن عمید وزیر آل بُویہ نے ایک دفعہ بیان کیا کہ میں اس خیال باطل میں تھا کہ وزارت و ریاست سے زیادہ پُرلطف کوئی چیز دنیا میں نہیں۔ مگر جب میں نے سلیمان ابن ایوب طبرانی اور جعانی کا مناظرہ سُنا تو اُس لطف کو بھول گیا۔ اس مناظرے میں طبرانی قوت حافظہ کے زور سے اور جعانی جودت ذہن کی مدد سے اپنے اپنے حریف پر غالب آنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اُنکی آوازوں میں بلندی پیدا ہونے لگی۔ ایک بار جوش میں جعانی نے کہا کہ میرے پاس ایک

---

[1] شق۔ ج ۱ صفحہ ۱۷۔

ایسی حدیث ہی جو سارے عالم میں کسی کے پاس نہیں۔ طبرانی "بسم اللہ سنائیے" جعانی نے سلسلۂ روایت شروع کیا۔ ابو خلیفہ تا سلیمان ابن ایوب۔ طبرانی "سلیمان ابن ایوب میرا ہی نام ہی اور ابو خلیفہ نے یہ حدیث مجھ ہی سے حاصل کی تھی اب تم مجھ سے اس کی سند عالی حاصل کر لو جعانی یہ سُنکر دم بخود رہ گئے۔ مجھ کو طبرانی کے اُس وقت کی فرحت دیکھکر یہ تمنا ہوئی کہ کاش میں طبرانی ہوتا تاکہ یہ لطف مجھ کو نصیب ہوتا[1]۔ ادیب بے مثل صاحب ابن عبّاد فخر الدولہ کے وزیر تھے ایک موقع پر امیر بخارا نوح سامانی نے اپنی وزارت کے لیے در پردہ انھیں طلب کیا۔ ابن عباد نے خفیہ نہ آسکنے کے جو عذر لکھے اُن میں یہ بھی تھا کہ صرف میری کتابوں کے اُٹھانے کے لیے چار سو اونٹوں کی ضرورت ہوتی ہی۔ وزیر ممدوح کے ہمراہ ہر سفر میں صرف ادب کی کتابوں کے تیس اونٹ رہتے تھے[2]۔ علامہ موفق الدین بغدادی ایک بار قاضی فاضل سے (جو سلطان صلاح الدین کے سب سے زیادہ مقرب امیر تھے) ملنے گئے تو اُن کو اس حال میں پایا کہ خود لکھ رہے تھے اور دو کاتبوں کو مضمون تبلاتے جاتے تھے۔ ان کے پہنچنے پر بہت سے علمی نازک سوال ان سے کیے مگر لکھنا اور مضمون تبلانا برابر جاری رہا۔ علامہ ممدوح بیان کرتے ہیں کہ وہ شخص سراپا قلب و دماغ معلوم ہوتا تھا۔ دوران تحریر میں لب و چہرے سے جو طرح طرح کی حرکات ہویدا ہوتی تھیں وہ صاف کہہ رہی تھیں کہ کس قدر ولولہ اُس کی طبیعت میں مضمون آفرینی کا تھا[3]۔

---

[1] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۲۹ [2] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۷۶ و ۳۳۴ [3] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۰۵

عنوانِ دوم

حق پسندی و راست گوئی

جس پاک گروہ کو ہم نے مدارس میں سرگرمِ طلبِ علم چھوڑا تھا اب اُس کی نسبت یہ دیکھنا ہی کہ مکتب اور مدرسہ سے باہر آکر اُس کے اخلاق اور اس کی طرزِ معاشرت کیسی رہی اس علاوہ اس کے کہ علما کے مزید حالات معلوم ہوں ہماری گزشتہ تعلیم کی نسبت یہ رائے قائم ہوسکے گی کہ وہ کس ڈھنگ کے انسان پیدا کرتی تھی۔ عنوان ہذا میں ہم اخلاق انسانی کی سب سے اعلیٰ اور افضل صفت کو اپنا موضوع قرار دیتے ہیں۔ وہ کیا۔ حق پسندی اور راست گوئی۔ دنیا میں شاید کوئی انسان ہوگا جو اس امر کا مدعی نہو کہ وہ حق اور راستبازی پر دل و جان سے شیدا ہی لیکن عمل (جو قول کی کسوٹی ہی) صاف کھرے اور کھوٹے کی حقیقت کھول دیتا ہی۔ اور حق یہ ہی کہ حق پسندی جتنی بے بہا صفت ہی اُسی قدر دشوار اور معرکہ خیز ہے۔ وہ شخص بے شک حق پرست ہوسکتا ہی جو زبردست کے خوف منفعت کی اُمید اور عزیزوں کی محبت کو حق پر سے نثار کر دے یا بالفاظ دیگر سوائے حق کے اُس کو کسی سے کچھ سروکار نہو۔ کیا فرمایا تھا حضرت خیر البشر نے اپنے صحابی جناب عمرؓ کی نسبت فترکہ الحقّ وماله من صدیق یعنی حق گوئی نے عمرؓ کو بے یار کر کے چھوڑا مگر ایسے انسان دُنیا میں بہت کم ہوئے ہیں۔ خداوند تعالیٰ جن دلوں کو اس قدر بے لوث فرما دیتا ہی کہ وہ بجز حق کے سب سے بیگانہ ہو جاتے ہیں وہ البتہ اس عالی رتبے کو حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک سچ

کے خاطر زبردست سے بے خوف۔ فائدے سے بے پروا اور عزیزوں سے ناآشنا رہنا بعید مشکل ہے اور غالباً کسی آدمی کی حق پرستی کے امتحان کے لیے ان حالتوں سے زیادہ عمدہ معیار رہات آنا ناممکن ہے۔ لہذا ہم علمائے سلف کی حق پسندی انہیں تینوں حق کے دشمنوں کے مقابلے میں ثابت کرینگے ورنہ وعظ اور تصنیف یہ دونوں تو بڑے دلکشا میدان اظہار حق کے ہیں

حق پسندی بمقابلۂ حکّام

لفظ حکام میں جس قدر جبروت اور قہاری اگلی تاریخ میں نظر آتی ہے اُسکی نظیر آج کل کے آئینی عہد میں ملنی ناممکن ہے۔ جس سلطنت کے زیر سایہ ہم رہتے ہیں وہ تو ایسی امن دوست اور رفاہ پسند ہے کہ ان مہیب صفات کا کوئی شمّہ ان ممالک میں نہیں پایا جاتا وَالحمدُ لِلّٰہِ علیٰ ذٰلِکَ مگر سارے عالم کے مخبر اخبار بھی ہم کو زمانۂ حال میں کوئی ایسا فرمانروا نہیں تبلاتے جس کے دربار میں حجاج ابن یوسف یا تیمور کی ہیبت کا نشان مل سکے۔ پس جب ہم اس دور عافیت میں حق پسندی کا قحط پاتے ہیں تو اگلے زمانے میں اس صفت کا وجود عنقا ہونا چاہیے تھا۔ لیکن واقعات اس کے خلاف ثابت کرنے کو آمادہ ہیں۔ اُن واقعات کو پڑھکر معلوم ہوتا ہے کہ جن بزرگوں نے اگلے جلّاد بادشاہوں کے عہد میں حق کو نباہا اُنھوں نے بڑا کام کیا۔

ایک مرتبہ حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہما) نے حجاج کو خطبہ پڑھتے دیکھا تو غضب آلود ہوکر برملا فرمانے لگے۔ خدا کا دشمن! خدا کی حرام کی ہوئی باتوں کو اس نے حلال کرلیا۔ خدا کے گھر کو خراب کیا اور خدا کے دوستوں کو قتل۔ حجاج نے اپنی نسبت یہ سخت کلمات سُنکر پوچھا کہ یہ کون ہے۔ کسی نے کہا عبداللہ ابن عمر۔ اتنا سُن کر وہ سفاک آپ کی طرف مخاطب ہوا اور کہنے لگا کہ بڑے میاں اب تم سٹھیا گئے ہو اور تمھارے حواس بجا نہیں رہے۔ منبر سے اُترا تو دل میں بخار بھرا ہوا تھا اپنے ایک ملازم کو ایما کیا اور اُس نے ایک زہر میں بُجھا ہوا حربہ

حضرت ابن عمر کے پاؤں پر مار دیا اسی ہتھیار کی سمیّت آپ کی وفات کا باعث ہوئی۔ مزید عنایت دیکھیے کہ جو مرض خود پیدا کیا تھا اُس کی عیادت کو آیا۔ مگر حضرت عبداللہ نے نہ اُسکے سلام کا جواب دیا نہ کلام کا[له]۔ جو واقعہ ہم آگے بیان کرتے ہیں وہ استقلال و ثابت قدمی کی ایک بے نظیر مثال پیش کرتا ہی۔ اور اُس سے ظاہر ہوتا ہی کہ حق پرستی اُن بزرگوں کے دل ایسے مضبوط کر دیتی تھی کہ موت اُن کے سامنے کھڑی ہوتی اور وہ بے پروائی سے ہنستے۔ اور جلاد کے ہات میں شمشیر برہنہ اُن کے واسطے کوئی خوفناک چیز ثابت نہوتی ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ جلیل القدر تابعی حضرت سعید ابن جُبیر سے دولت بنی امیہ مخالف ہوگئی تھی اور یہ بچتے پھرتے تھے۔ مگر ایسی زبردست سلطنت کے پنجے سے بچنا ناممکن تھا۔ والی مکہ نے ایک موقع پر ان کو پکڑ کر حجاج کے پاس بھیجدیا۔ اُس کی جفاجو طبیعت کو گویا ایک ضیافت ہات آئی۔ اول تو نام پوچھا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ سعید ابن جبیر۔ حجاج اس قدر طیش میں تھا کہ اُس کو ان کے نام کے اچھے الفاظ بھی تلخ معلوم ہوئے۔ اور جوشِ غضب میں کہا کہ انت شقی بن کسیر۔ سعید۔ میری والدہ میرا نام تجھ سے بہتر جانتی تھیں۔ حجاج اور بگڑا اور کہا کہ شقیت امك وشقيت انت یعنی تمھاری والدہ بھی بدبخت اور تم بھی بدبخت۔ سعید غیب کا جاننے والا تیرے سوا اور ہی۔ حجاج (جلکر) دیکھو تو میں تم کو دُنیا کے بدلے میں کیسی لپٹیں مارتی ہوئی آگ دیتا ہوں۔ سعید۔ اگر میں یہ جانتا کہ یہ تیرے اختیار میں ہی تو میں تجکو اپنا معبود بنا لیتا۔ اب حجاج نے (جو اُن کے قتل کے لیے بہانہ ڈھونڈھتا تھا) اُن سے مذہبی سوال شروع کیے جو پولیٹکل پہلو لیے ہوئے تھے۔ اور پوچھا کہ آنحضرتؐ کی نسبت تمھارا کیا قول ہی۔ سعید۔ آپ نبی رحمت اور امام ہدیٰ تھے۔ خلفا کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہی

[له] تذ۔ ج ا صفحہ ۳۲

سعید۔ لست علیہم بوکیل (میں اُن کا قاضی نہیں) حجاج۔ اُن میں کون سب سے بہتر تھا۔ سعید۔ ارضاھم لخالقی جو میرے مالک کی مرضی کا سب سے زیادہ پابند تھا۔ حجاج۔ کون سب سے زیادہ رضا جو تھا۔ سعید۔ علم ذلک عند الذی یعلم سرھم و نجوٰھم (اس کو وہ خوب جانتا ہے جو اُن کے بھیدوں سے اور پوشیدہ باتوں سے واقف ہے) غرض عرصے تک اس قسم کے سوال وجواب ہے مگر حضرت ابن جُبیر نے کوئی موقع گرفت کا نہیں پیدا ہونے دیا۔ اور اپنے صاف صاف مگر چبے تُلے جوابوں سے حجاج کی برہمی برابر بڑھاتے گئے۔ آخر اُس نے کھسیا کر کہا اختر یا سعیدُ ای قتلۃ اقتلک (اے سعید بتاؤ میں کس شکل سے تم کو قتل کروں)۔ سعید۔ اختر یا حجاج لنفسک فواللہِ لا تقتلنی قتلۃ الا قتلک اللہ مثلہا (اے حجاج تو خود ہی پسند کر قسم رب کی جس طرح تو مجھ کو قتل کرے گا اُسی طرح خدا تجھ کو قتل کرے گا) حجاج کیا میں معاف کر دوں۔ سعید۔ اگر عفو ہو تو خدا کی طرف سے ہو۔ رہا تو بس تو نہ کسی کو بری کر سکتا ہے نہ کسی کا عذر قبول۔ اتنی بحث کے بعد حجاج نے آخری حکم دیدیا اور جلاد حضرت جُبیر کو باہر لائے۔ حجاج تو اپنی انتہائی طاقت صرف کر چکا تھا۔ لیکن خدا کے سعید بندے کو ابھی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ باہر آکر ہنسے۔ حجاج کو خبر ہوئی تو اُس نے پھر بُلایا اور ہنسی کی وجہ دریافت کی۔ ابن جُبیر نے فرمایا۔ عجبت من جراٴتک علی اللہ وحلم اللہ علیک (مجھ کو خدا کے مقابلے میں تیری جراٴت پر اور تیری نسبت خدا کے حلم پر تعجب ہوا) حجاج اس گرم فقرے کو سُن کر اور بھڑکا اور جلادوں سے کہا میرے سامنے گردن مارو۔ اب ابن جُبیر شہادت کے لیے مستعد ہو گئے اور قبلہ رو ہو کر فرمایا۔ وَجَّھتُ وَجھِیَ لِلَّذِی فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضَ حَنِیفًا وَّمَا اَنَا مِنَ المُشرِکِینَ۔ حجاج۔ ان کا مُونھ قبلے سے پھیر دو۔ سعید۔ اینما تولوا

---

۵۷ میں نے اپنا مونھ کیا اُسی کی طرف جس نے بنائے آسمان و زمین ایک طرف کا ہو کر اور میں نہیں شریک کرنے والا ۱۲

فثم وجه الله (جدہر تم پھرو گے اُسی طرف خدا کا موںھ ہی) حجاج۔ اوندھا ڈالدو سعید۔ منہا خلقناکم وفیہا نعیدکم ومنہا نخرجکم تارۃ اُخریٰ (ہم نے اُسی سے (یعنی زمین سے) تم کو پیدا کیا اور اُسی میں تم کو لوٹائیں گے اور اُسی سے ایک دفعہ تم کو پھر نکالیں گے) حجاج نے اُن کی سیف زبانی سے تنگ ہوکر جلادوں کو اشارہ کیا کہ جلد اپنا کام کرو۔ سعید سُن لے میں اس کی شہادت دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہی اور کوئی اُس کا شریک نہیں۔ اور اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ محمدؐ اُس کے بندے اور رسول ہیں میری جان تو لے جب تو میدان حشر میں مجھ کو ملے گا تو میں تجھ سے لے لوں گا۔ حضرت ابن جبیر کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ جلاد کا ہات اُٹھا اور اُنکا سر تن سے جُدا ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

بنا کردند خوش رسمی بخون وخاک غلتیدن ۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

بعد قتل اُن کے جسم سے خلاف معمول خون بہت نکلا جس سے حجاج سے سفاک کو بھی حیرت ہوئی۔ اور اُس نے اپنے طبیب خاص تیا ذوق سے اس کی وجہ دریافت کی۔ تیا ذوق نے کہا کہ چونکہ اُن کی خاطر بالکل مطمئن تھی اور قتل کا خوف قطعاً اُن کے دل میں نہ تھا اس لیے خون اپنی اصلی مقدار پر قائم رہا۔ بخلاف اور مقتولوں کے کہ اُن کا خون ہیبت کے مارے پہلے ہی خشک ہوجاتا ہی۔ علاوہ اس طبی شہادت کے حضرت ابن جبیر کے کلام کی برجستگی صاف کہہ رہی ہی کہ اُن کی طبیعت بالکل آسودہ اور آرمیدہ تھی اور اضطراب کا نام بھی اُن کے قلب میں نہ تھا۔ یہ شعبان ۹۵ھ کا واقعہ ہی۔ رمضان سنہ مذکور میں حجاج بھی راہی عدم ہوگیا [۵]

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را ۔ چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند [۱]

انھیں کے ہم نام اور ہمعصر دوسرے تابعی حضرت سعید بن المسیب کا ذکر ابن السائب کرتے ہیں کہ

---

[۵] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۰۵ وعیون۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۲۳

ایک روز وہ اور میں دونوں بازار میں بیٹھے تھے کہ خلیفہ دمشق کا برید (نامہ بر) وہاں سے گزرا
ابن المسیب نے اُس سے پوچھا کہ تم بنی مروان کے برید ہو۔ برید۔ جی ہاں۔ ابن المسیب۔
تم نے اُن کو کس حال میں چھوڑا۔ برید۔ بخیر۔ ابن المسیب نہیں بلکہ تم نے اُن کو اس حال میں
چھوڑا ہی کہ وہ آدمیوں کو بھوکا مارتے ہیں اور کتوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ برید یہ سُنکر بگڑ گیا۔
اور آنکھیں نکال کر اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ ابن السائب کہتے ہیں کہ میں دہشت زدہ ہو کر کھڑا
ہو گیا کہ دیکھیے اب کیا ہو۔ برید دیر تک تیور بدلے کھڑا رہا مگر پھر کچھ سوچ کر چلدیا۔ جب وہ چلا گیا
تو میں نے کہا ابن المسیب خدا تم کو نیکی دے تم کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو۔ اُنھوں نے
فرمایا بیہودہ چُپ رہ جب تک میں حق پر قائم ہوں واللہ خدا مجھ کو دشمنوں کے قبضے میں نہ دیگا۔
ایک دفعہ تیس ہزار درہم دولت مذکور کی طرف سے اُن کی خدمت میں پیش کیے گئے تو اُنھوں
نے فرمایا کہ نہ مجھ کو بنی اُمیہ کی پرواہ ہی نہ ان کے مال و دولت کی۔ میں خدا کے سامنے جاؤں گا
اور وہ میرا اور اُن کا انصاف کرے گا۔ انھیں حق گوئیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ خلیفہ عبدالملک نے
جاڑے کے موسم میں اُن کو بٹھا کر سر پر پانی ڈلوایا اور ایک دوسرے موقع پر پچاس درّے
لگوا کر سر بازار تشہیر کرائی[1]۔ عمر بن ہبیرہ جب خلیفہ دمشق یزید ابن عبدالملک کی جانب سے والی
عراق و خراسان مقرر ہو کر آیا تو اُس نے خواجہ حسن بصری۔ امام ابن سیرین اور امام شعبی کو طلب
کیا اور اُن کے سامنے یہ مدبرانہ تقریر کی۔ یزید ابن عبدالملک کو خداوند تعالےٰ نے اپنے بندوں پر
خلیفہ مقرر کیا ہی اور اُن سے اُس کی اطاعت کا عہد لیا ہی اور ہم سے (یعنی ملازموں سے)
اُس کے حکم سُننے اور بجا لانے کا۔ مجھ کو جو عہدہ خلافت کی طرف سے عطا ہوا ہی وہ آپ سب کو
معلوم ہی۔ خلیفہ کی جانب سے ایک حکم مجھ کو ملتا ہی اور میں اُس کی بے تامل تعمیل کرتا ہوں۔

[1] ابن۔ ج ا صفحہ ۲۰۷۔

اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ خواجہ حسن بصری نے اس پولیٹیکل گفتگو کا جواب جن صاف اور سچے الفاظ میں دیا وہ قابل شنید ہیں۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اے ابن ہبیرہ! یزید کے معاملے میں خدا تعالےٰ سے ڈر اور خدا تعالےٰ کے معاملے میں یزید کا خوف مت کر۔ خدا تعالےٰ تجھ سے یزید کے شر کو دفع کر سکتا ہے۔ مگر یزید اس احکم الحاکمین کے قہر کو نہیں روک سکتا۔ وہ وقت بہت دُور نہیں ہے کہ خداوند عالم تیرے پاس اپنا ایک فرشتہ بھیجیگا جو تجھ کو شاندار تخت اور وسیع محل سے علیحدہ کر کے تنگ قبر میں پہنچا دیگا۔ وہاں سوائے تیرے اعمال کے کوئی تجکو نجات نہیں دلوائے گا۔ اے ابن ہبیرہ! اگر تو خدا کا گناہ کرے تو خوب سمجھ لے کہ خلیفہ کو اُس نے اپنے دین کا اور اپنے بندوں کا محافظ اور ناصر مقرر کیا ہے۔ پس خدا کے دین کے خلاف اس کے مقرر کیے ہوئے حاکم کی وجہ سے جسارت مت کر۔ کیونکہ خالق اکبر کے مقابلے میں مخلوق کا حکم ماننا کسی طرح روا نہیں[۱]۔ اسی یزید ابن ہبیرہ نے امام اعظم کو ایک دفعہ طلب کر کے عہدۂ قضا قبول کرنے کے واسطے کہا۔ امام صاحب چونکہ یہ بار اپنے ذمّے لینا نہیں چاہتے تھے لہذا انکار کر دیا۔ ابن ہبیرہ اس انکار سے بگڑ گیا اور گیارہ روز تک دس دس دِرّے روزانہ ان کے لگوائے۔ تاہم اُس کا اصرار ان کے انکار پر غالب نہ آسکا۔ اِسی عُہدۂ قضا کی بدولت امام ابو حنیفہ کے مقدر میں درسختی لکھی تھی۔ جب منصور بغداد کا خلیفہ ہوا تو اُس کی نظر بھی اس منصب کے لیے امام ممدوح پر ٹھہری چنانچہ اُن کو کوفے سے طلب کیا اور عُہدۂ مذکور کے قبول کرنے کی فرمائش کی۔ امام صاحب اب بھی اپنی رائے پر سختی سے قائم تھے لہذا عذر کیا۔ منصور نے قسم کھا کر کہا کہ میں تم کو قاضی مقرر کروں گا۔ اُنھوں نے جواباً بالقسم فرمایا کہ میں اس عُہدے کو منظور نہیں کروں گا۔ خلیفہ نے دوبارہ قسم کھائی۔ اُنھوں نے مکرر قسمیہ انکار کیا اور اپنے انکار

---

[۱] ۔ ابن۔ ج ا صفحہ ۱۲۸

کی وجہ یہ بیان کی کہ میں اپنے آپ کو اس منصب کے قابل نہیں سمجھتا۔ حاجب ابن ربیعہ نے (جو دربار میں حاضر تھا) خلیفہ کی خوشامد کی راہ سے کہا کہ امیرالمومنین قسم کھا چکے ہیں پھر بھی تم انکار کیے جاتے ہو۔ امام فقہ نے فرمایا کہ امیرالمومنین کے لیے کفارہ قسم ادا کر دینا بہ نسبت میرے زیادہ آسان ہے۔ خلیفہ جب اُن کی رائے کو کسی طرح مقید نہ کر سکا تو خود اُن کو قید جانے بھیجدیا اور بحالت محبوسی ۱۵۰ھ[۱] میں امام اعظم نے وفات پائی۔ ان دونوں واقعوں کیساتھ ایک تیسرا واقعہ اور ملا لیجیے جس سے امتیاز مراتب کا نکتہ حل ہو گا۔ ایک زمانے میں حاکم کوفہ نے یہ حکم دیدیا تھا کہ ابوحنیفہ فتویٰ نہ دیا کریں۔ چنانچہ امام صاحب نے فتویٰ دینا چھوڑ دیا تھا۔ انہیں روزوں کا ذکر ہے کہ ایک دن امام ممدوح گھر میں تشریف رکھتے تھے بی بی اور بچے پاس تھے۔ صاحبزادی نے روزے کے متعلق ایک مسألہ پوچھا۔ آپ نے فرمایا بیٹیا! یہ مسألہ اپنے بھائی حماد سے پوچھ لو مجھ کو حاکم کی طرف سے فتویٰ دینے کی ممانعت ہے۔ اس لیے میں تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔[۲] کیا اس سے بڑھ کر حق پرستی ہو سکتی ہے۔ عہدہ قضا قبول نہ کرنا اپنے نفس کا حق تھا جس کو اُنھوں نے حاکم اور خلیفہ کے مقابلے میں برسر دربار نہیں چھوڑا۔ اور فتویٰ نہ دینا حاکم کا حق تھا جس کو اُنھوں نے خلوت اور گھر کی چار دیواری کے اندر بھی ملحوظ رکھا۔ امام یزید ابن حبیب تابعی ایک دفعہ علیل تھے۔ ابن سُہیل والی مصر اُن کی عیادت کو آیا۔ اثنائے کلام میں اُس نے پوچھا کہ جس کپڑے پر مچھر کا خون لگا ہو اُس سے نماز جائز ہے یا نہیں۔ امام نے یہ سُنکر غصّے سے مونھ پھیر لیا اور کچھ نہیں کہا۔ جب امیر نے چلنے کا قصد کیا تو اُس کو نظر بھر کر دیکھا اور کہا کہ تو روزانہ خدا کے بندوں کا تو خون بہاتا ہے اور مچھر کے خون کا فتویٰ پوچھنے چلا ہے۔[۳] خلیفہ دمشق ہشام ابن عبدالملک نے

[۱] ابنا۔ ج ۱ صفحہ ۴۵۱ و ج ۲ صفحہ ۱۶۳ و ۱۶۴ و ۱۶۶۔ [۲] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۱۶

اپنا ایک معتمد امام عمش کوفی کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ اُن سے حضرت عثمان کی خوبیاں اور حضرت علی کی بُرائیاں لکھوا لائے۔ جب ایلچی نے خلیفہ کا شُقہ دیا تو اُنھوں نے اُس کو پڑھکر ایک بکری کے مونھ میں دیدیا بکری اُس کو چبا چکی تو معتمد خلافت سے فرمایا کہ اپنے آقا سے کہدینا کہ اُس کے پروانے کا یہی جواب ہی۔ قاصد کو حکم تھا کہ جواب تحریری لائے لہذا اُس نے منت کی کہ جو کچھ جواب ہو لکھدیجیے اصرار سے تنگ آکر اُنھوں نے یہ جواب لکھدیا۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم اما بعد فیا امیر المومنین لو کان لعثمان رضی اللہ عنہ مناقب اھل الارض ما نفعتک ولو کانت لعلی رضی اللہ عنہ مساوی اھل الارض ما ضرتک فعلیک بخویصۃ نفسک والسلام یعنی اے امیر المومنین اگر حضرت عثمان میں سارے جہان کی خوبیاں تھیں تو تجھ کو کچھ نفع نہیں اور اگر حضرت علی میں دنیا بھر کی بُرائیاں تھیں تو تیرا کچھ نقصان نہیں۔ پس تو خاص کر اپنے نفس کی خبر لے۔ والسلام۔ ابو جعفر منصور خلیفہ بغداد نے ایک بار امام مالک اور امام عبد اللہ ابن طاؤس کو اپنے پاس بلایا اور اثنائے ملاقات میں ابن طاؤس سے کہا کہ اپنے والد سے کوئی حدیث روایت کرو۔ اس فرمایش سے ابن طاوس کے ہات اس امر کا گویا موقع لگا کہ وہ خلیفہ کو اُس کی بے اعتدالیوں اور سختی پر تنبیہ کرے۔ اور اُنھوں نے یہ حدیث انتخاب کرکے سُنائی حدثنا ان اشد الناس علیٰ ابی یوم القیامۃ رجلٌ اشرکہ اللہ تعالیٰ فی سلطانہ فادخل علیہ الجور یعنی میرے والد نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی ہی کہ قیامت کے دن سب سے بڑھ کر عذاب اُس کو ہوگا جس کو خدا تعالے اپنی حکومت میں شرکت دے اور پھر وہ ظالمانہ حکومت کرے۔ منصور سے قہار فرماں روا کے سامنے اور یہ جرأت۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ مجھ کو ابن طاؤس کے قتل کا

لہ ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۱۳

پورا یقین ہوگیا اور میں نے اپنے دامن سمیٹ لیے کہ مبادا اُن کے خون کی چھینٹیں میرے کپڑوں پر پڑیں۔ خلیفہ دیر تک ساکت رہا پھر نگاہ اُٹھائی اور ایک اور سوال کیا۔ ابن طاؤس کے قلب پر اب بھی خلیفہ کا رعب غالب نہیں آیا تھا۔ اس سوال کا جواب بھی پوری آزادی سے دیا۔ خلیفہ نے تنگ آ کر کہا قوما عنی یعنی میرے پاس سے دونوں اُٹھ جاؤ۔ ابن طاؤس نے فرمایا ذالک ماکنّا نبغی یہ تو ہماری عین مراد ہی۔ اور یہ کہکر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ اُس روز سے میں ابن طاؤس کے فضل کو مان گیا ہوں[1]۔ فقہ کے چار امام جنکی امامت آج تک چار دانگ عالم میں مسلّم ہی اور کروروں نفوس انسانی پر اُن کی روحانی سلطنت صدہا برس سے قائم ہی اُن میں سے امام ابو حنیفہ کا حال آپ سُن چکے۔ امام مالک نے ایک دفعہ ستّر دُرّے اسوجہ سے مارے گئے کہ کسی مسائلے میں حق کا اور حکومت کا مقابلہ تھا اور اُنھوں نے فتویٰ دینے میں حق کی رعایت کی تھی[2]۔

یہی سلوک امام احمد ابن حنبل کے ساتھ خلیفہ مامون الرشید کی خلافت میں عقائد کے ایک مسائلے کے اختلاف کی وجہ سے کیا گیا[3]۔ ایک دن کا ذکر ہی کہ خلیفہ منصور کے چہرے پر مکھّی بیٹھی اُس نے اُڑا دی۔ مکھی حسب عادت پھر آن بیٹھی خلیفہ نے پھر اُڑا دی۔ غرض کئی دفعہ یہی اتفاق ہوا۔ آخر خلیفہ نے جھلا کر ابن سلیمان مشہور مفسّر سے پوچھا کہ مکھّی پیدا کرنے کی خدا کو کیا ضرورت پڑی تھی۔ اُس عالم ربانی نے فرمایا کہ متکبّروں کا غرور توڑنے کے لیے پیدا کی[4]۔ خلافت عباسیّہ نئی نئی قائم ہوئی تھی اور خاندان بنی اُمیہ کے نیست و نابود کرنے اور ملک سے اُن کا اثر مٹانے کی کوششیں بڑی بیدردی اور سفّاکی سے عمل میں آرہی تھیں کہ اسی اثنا میں عبداللہ ابن علی خلیفہ سفاح کا چچا شام کا حاکم مقرر ہوا۔ امیر مذکور نے

[1] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۳۳ [2] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۴۳۹ [3] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۶۴ [4] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۱۲۔

وہاں پہنچکر اول تو خلافت کے بقیۃ دعویداروں کی پوری صفائی کی اُسکے بعد ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا جس میں جاہ وجلال کا اظہار انتہا کو پہنچایا گیا تھا۔ چار جنگی صفیں ایوان دربار میں قائم تھیں جو مختلف مہیب ہتھیاروں سے مسلح تھیں۔ ان صفوں کے بیچ میں تخت امارت نصب تھا۔ جب امیر نے دربار میں آکر جلوس کیا تو شام کے مقتدا امام اوزاعی طلب ہوئے۔ امام ممدوح جس وقت دارالامارۃ کے دروازے پر پہنچے تو گھوڑے پر سے اُتار لیے گئے اور دو آدمیوں نے اُن کے بازو پکڑکر تخت سے اتنا قریب لا کھڑا کیا کہ امیر خود اُن سے کلام کر سکے۔ امیر نے ان کو دیکھکر کہا کہ تمھارا نام عبدالرحمٰن ہی۔ امام اوزاعی۔ جی ہاں۔ خدا امیر کو صلاحیت دے۔ امیر۔ بنی اُمیّہ کی خونریزی کی نسبت تمھاری کیا رائے ہی۔ امام۔ تمھارے اور اُن کے مابین چونکہ عہد تھا اس لیے تم کو لازم تھا کہ عہد وپیمان کی رعایت کرتے اور عہد شکنی نہ کرتے۔ امیر (بگڑکر) یہ ہم جانیں اور وہ جانیں۔ ہم میں باہم کوئی عہد نہ تھا۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ امیر کے تیور پھرے دیکھکر میرے قلب پر بیکسی کی سی حالت طاری ہوئی اور جان کا خوف معلوم ہونے لگا۔ اُسی وقت مجھ کو خیال آیا کہ عبدالرحمٰن! ایک دن اس سے بھی بڑے حاکم کے حضور میں حاضر ہونا ہے اس خیال کے آتے ہی میرے دل کا اضطراب جاتا رہا اور قوت سی پیدا ہوگئی اور میں نے صاف صاف امیر سے کہا کہ بیشک اُن کا خون تم پر حرام تھا۔ اس زوردار فقرے کو سُن کر امیر طیش کے مارے تھرا گیا جوشِ خون سے آنکھیں سُرخ ہوگئیں اور رگیں اُبھر آئیں ایسی غضب کی حالت میں کہنے لگا کہ ویحک اللہ[1] یہ تم نے کس طرح کہا۔ امام۔ اس طرح کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہی کہ کسی فرد مسلمان کا قتل روا نہیں جب تک کہ ان

---

[1] خدا تم پر رحم کرے ۱۲

تین حالتوں میں سے ایک حالت پیش نہ آئے یا تو وہ اس حال میں زنا کرے کہ اُسکی شادی ہو چکی ہو۔ یا قاتل ہو۔ یا مرتد ہو جائے۔ امیر۔ کیوں! کیا ہماری حکومت دینی نہیں۔ (گویا اسکا یہ مطلب تھا کہ چونکہ ہماری خلافت از روے دین ثابت ہی لہذا اُس کا مخالف تارک دین ہوا) امام۔ تمھاری حکومت دینی کیونکر ہو سکتی ہی۔ امیر۔ کیا آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کے لیے وصیّت نہیں فرمائی۔ امام۔ اگر حضرت علی کے لیے وصیّت ثابت ہوتی تو دونوں حَکَم حکم نہ دیتے۔ امیر کے پاس چونکہ اس کا جواب کچھ نہ تھا اس لیے خاموش تو ہو گیا مگر شدت اشتعال کے سبب سے سراپا غضب معلوم ہوتا تھا۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ امیر کی خاموشی نے مجھ کو یقین دلا دیا کہ کوئی دم میں میرا سر قدموں پر آتا ہی۔ تھوڑے عرصے کے بعد خلاف توقع امیر نے ہات کے اشارے سے حکم دیا کہ امام دربار سے باہر کر دیئے جائیں۔ چنانچہ یہ وہاں سے تشریف لے آئے۔ دار الامارۃ سے کچھ دُور نکلے تھے کہ ایک سوار ان کی طرف تیز آتا ہوا نظر پڑا۔ سوار کو دیکھکر جان کا خوف امام اوزاعی کو اول سے بھی زیادہ ہوا۔ اور وقت اخیر سمجھکر نماز شروع کر دی۔ جب سلام پھیرا تو سوار نے سلام کیا اور اشرفیوں کی ایک تھیلی منجانب امیر پیش کی۔ اُنھوں نے وہ اشرفیاں قبول کر لیں۔ اور گھر پہنچنے سے پہلے مستحقوں کو تقسیم کر دیں[1]۔ اسلام نے بیت المال کی بنیاد جن اصُول پر ڈالی تھی وہ خلافت راشدہ کے بعد بالکل بدل گئے تھے۔ اور مسلمانوں کا قومی مال محض خلفا و سلاطین کا جیب خرچ خیال کیا جاتا تھا۔ جو علماے اسلام بیت المال کے اصلی اغراض سے واقف تھے اُن کے دل اِس اسراف کو دیکھ دیکھ کر کُڑھتے تھے۔ اور جب اُن کو موقع ہات آتا اُن کی زبان خلفا کو برملا متنبہ کرنے سے باز نہیں رہتی تھی۔ حضرت سُفیان ثوری ایک دفعہ

---

[1] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۶۲

خلیفہ مہدی کے پاس گئے اور اُس سے کہا کہ مجھ کو یہ روایت پہنچی ہے کہ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے اپنے ایک سفر حج میں صرف بارہ اشرفیاں صرف کی تھیں۔ تمھارا اِسراف جس حد کو پہنچا ہے وہ ظاہر ہے۔ خلیفہ نے خشمناک ہو کر کہا تم اپنی سی ذلیل حالت میری بھی کیا چاہتے ہو۔ حضرت سفیان نے جواب دیا کہ مجھ سے مت بنو مگر جس حال میں ہو اُس میں تو کمی کر دو۔[1]

ایک دفعہ ہارون الرشید اور شاہزادے امام مالک کے یہاں گئے۔ خلیفہ نے امام صاحب سے حدیث سنانے کی فرمائش کی امام ممدوح نے فرمایا کہ میں نے عرصے سے طریقۂ قرات چھوڑ دیا ہے اب اور لوگ حدیث مجھ کو سناتے ہیں اور میں سنتا ہوں۔ ہارون الرشید نے کہا کہ بہتر ہے میں ہی سناؤں گا۔ مگر اول عام آدمیوں کو اپنی مجلس سے باہر کر دیجیے امام مالک نے جواب میں ارشاد کیا کہ اگر خواص کی خاطر سے عوام محروم کیے جائیں گے تو خواص کو بھی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ یہ فرما کر اپنے ایک شاگرد ابن عیسیٰ کو حکم دیا کہ سبق شروع کریں۔ چنانچہ ابن عیسیٰ نے فوراً سبق شروع کر دیا اور خلیفہ کو خاموش رہنا پڑا۔[2]

خلیفہ مذکور نے ایک بار ابن ادریس کو بلا کر عہدۂ قضا قبول کرنے کے واسطے کہا۔ انھوں نے انکار کیا تو رشید نے بگڑ کر فرمایا کہ کاش میں تیری صورت نہ دیکھتا۔ ابن ادریس نے متانت سے جواب دیا کہ کاش میں تیری صورت نہ دیکھتا۔ اور یہ کہکر دربار سے چلے آئے۔[3]

امیر سلیمان ابن علی نے اہواز سے ایک قاصد امام ادب خلیل بصری کے پاس بھیجا اور اُنکو امیر زادے کی تعلیم کے لیے طلب کیا۔ ایلچی کی خبر پاکر وہ ادیب بے مثل باہر آیا۔ خشک روٹی کا ایک ٹکڑا ہات میں تھا۔ وہ ٹکڑا قاصد کو دیا اور کہا کہ لو میرے پاس تو یہی ماحضر ہے اور جب تک یہ موجود ہے خلیل کو سلیمان کی پروا نہیں۔ اس کے بعد یہ اشعار لطیف فی البدیہ

---

[1] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۱۸۵ [2] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۱۹۱ [3] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۲۵۸

تصنیف کرکے اُس کے حوالے کیئے[1] ابلغ سلیمان انی عند فی سعتہ * وفی غنی غیر انی لست ذامال * سخی بنفسی انی لا اری احدا * یموت ھزلا و لا یبقی علی حال والفقر فی النفس لا فی المال تعرفہ * ومثل ذالک الغنی فی النفس لا المال * فالرزق عن قدر لا العجز ینقصہ * ولا یزیدک فیہ حول محتال[2] - * شہر دمشق ایک صدی تک دولت بنی اُمیّہ کا دارالخلافہ رہا تھا اس لیے خارجیت کا وہاں بڑا زور تھا۔ امام نسائی رجنکی سُنن صحاح ستہ میں شامل ہی جب وہاں تشریف لے گئے تو ایک روز مسجد میں ایک شامی نے اُنسے پوچھا کہ حضرت معاویہ کے فضائل کیا کیا ہیں۔ امام ممدوح نے فرمایا کہ تو اس کو کافی نہیں سمجھتا کہ وہ اپنی جان بچا لیجائیں جو تو اُن کے مناقب پوچھنے چلا ہی۔ اس فقرے کو سُنکر دمشقی بھڑک اُٹھے اور اسقدر ضربیں امام نسائی کے ایک نازک مقام پر ماریں کہ وہ بیہوش ہو گئے۔ حالت بیہوشی میں اُن کے رُفقا اُن کو مسجد سے باہر لائے اور اُسی دردناک صدمے سے اُس امام حدیث نے وفات پائی[3]۔ امام سلفی کے درس میں ایک دن بادشاہ مصر مع اپنے بھائی کے آکر شریک ہوا۔ اور وہاں بیٹھکر بھائی سے باتیں کرنے لگا۔ یہ سوء ادب دیکھکر امام موصوف نے بادشاہ کو سرزنش کی اور فرمایا کہ ہم حدیث نبوی اس لیے نہیں پڑھ رہے ہیں کہ تم یہاں بیٹھکر باتیں کرو[4]۔ ابو غالب لغوی نے جب اپنی کتاب فن لغت میں تصنیف کی تو امیر مجاہد مرشیہ کے با اقتدار فرمانروا نے اپنے ایک معتمد کے ہاتھ ایک ہزار اشرفیاں اُنکے پاس بھیجیں اور یہ فرمائش کی کتاب مذکور کے دیباچے میں یہ الفاظ درج کر دیں مما الفہ ابو غالب الی الجیش مجاھد یعنی اس کتاب کو ابو غالب نے امیر مجاہد کے لیے تصنیف کیا ہے۔ ابو غالب نے عطیۂ شاہی واپس کر دیا اور کہلا بھیجا کہ اگر ساری دُنیا

---

[1] نزہتہ صفحہ ۷۵ [2] تذ - ج ۲ - صفحہ ۲۶۹ [3] تذ - ج ۴ - صفحہ ۹۶

مجھ کو دیجائے تو بھی میں جھوٹ بولنا روا نہیں سمجھوں گا۔ میں نے یہ کتاب خاص کر امیر کے واسطے تالیف نہیں کی بلکہ عام نفع کے خیال سے لکھی ہے[1]۔ ابن السکیت مصنف اصلاح المنطق خلیفہ بغداد متوکل کی خدمت میں حاضر تھے کہ خلافت کے تحت جگر معتز اور مؤید موجود ہوئے متوکل نے اُن سے پوچھا کہ یعقوب تمکو کون زیادہ محبوب ہے۔ میرے یہ دونوں بیٹے یا حسنینؓ۔ ابن السکیت نے جواب دیا کہ واللہ حضرت علی کا خادم قنبر تم سے اور تمھارے دونوں بیٹوں سے کہیں بہتر ہے۔ کیا اس تصریح کی ضرورت ہے کہ خلیفہ کے دل میں ان الفاظ نے کیا تاثیر کی۔ جس زبان سے یہ الفاظ نکلے تھے وہ خلیفہ کے حکم سے باہر نکال لی گئی اور زبان کے ساتھ روح نے بھی جسم سے مفارقت کی[2]۔ قاضی ابن رُشد مشہور فلسفی جب امیر منصور خلیفہ اُندلس کے حضور میں کوئی علمی مسائلہ بیان کرتے تھے تو نشأ کمال اُن کے دل سے خلیفہ کی عظمت مٹا دیتا اور ان معمولی الفاظ سے خطاب کرتے اسمع یا اخی۔ یعنی سُن اے بھائی[3]۔ مولانا شمس الدین رومی کی عدالت میں ایک معاملے میں سُلطان بایزید نے شہادت دی تو شہادت سلطانی کو اُنھوں نے قبول نہیں کیا جب سُلطان نے وجہ پوچھی تو مولانا نے جواب دیا کہ سلطان نماز میں جماعت کا پابند نہیں اور تارک جماعت کی شہادت مردود ہے[4]۔ سُلطان محمد خاں نے ایک بار اپنا موسوم (مراسلہ) قاضی بروسہ مولانا شمس الدین کورانی کے پاس بھیجا۔ اُس میں کوئی بات خلاف شرع درج تھی۔ مولانا اس کو دیکھکر اتنا برافروختہ ہوئے کہ سلطانی فرمان پھاڑکر لانے والے کو باہر نکالدیا سلطان کو اُن کی یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی اور غضب سلطانی کا یہ نتیجہ ہوا کہ مولانا کو عہدۂ قضا کے ساتھ سلطنت روم بھی چھوڑنی پڑی[5]۔ مولانا ابن خطیب ایک روز عید کی مبارکبا دینے

[1] ابن۔ ج ا صفحہ ۷۹ [2] ابن۔ ج ۲ صفحہ ۳۰۹ و ۳۱۱ [3] عیون۔ ج ۲ صفحہ ۷۷ [4] شق۔ ج ا صفحہ ۲۸ [5] شق۔ ج ا صفحہ ۹۱

ایوان سلطانی کو گئے اُن دنوں وہ خزانۂ سلطنت کے وظیفہ خوار بھی تھے۔ اور سو درہم یومیہ اُنکو
ملتے تھے جب دربار کو چلے تو چند طلبہ ہمرکاب تھے حضور سلطانی میں پہنچے تو سلطان نے
از راہ حُسن اخلاق سات قدم بڑہ کر استقبال کیا۔ مولانا نے بجاے جُھک کر آداب بجالانے
کے سلام کیا اور بجاے دست بوسی کے مصافحہ۔ اُن کے ایک شاگرد کو اُستاد کا یہ خلاف آداب
برتاؤ ناگوار گزرا اور واپسی میں اُس نے کہا کہ آخر سلطان فرمانرواے وقت ہیں کچھ تو آپ کو
جُھکنا تھا۔ ابن خطیب نے فرمایا کہ آیا یہ فخر سلطان کے لیے کم ہی کہ ابن خطیب سا فاضل اُنکے
پاس گیا۔ اور میں خوب جانتا ہوں کہ سلطان اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں[1]۔ مولانا یوسف
قاضی قسطنطنیہ ایک دن مسجد سے نماز پڑہ کر نکلے تو دروازے پر صدر اعظم کے چوبدار کو حاضر
پایا جو اُن کے بلانے کو آیا تھا۔ اُس وقت مولانا کے سر پر چھوٹا سا عمامہ تھا۔ چھوٹا عمامہ
باندہ کر بارگاہِ وزارت میں جانا خلاف ادب تھا۔ مگر خدا پرست مولانا کے دل نے گوارا
نہ کیا کہ رب العزت سے زیادہ ادب اُس کے ایک بندے کا کریں اُسی عمامے کو باندھی
صدر اعظم کے حضور میں چلے گئے۔ وہاں پہنچے تو اعتراض ہوا۔ اُنھوں نے راستبازی سے
اپنا خیال صاف صاف ظاہر کر دیا۔ جس کو سُنکر وزیر اعظم نے بہت پسند کیا اور حضور
سُلطانی میں اُس کی نقل کی[2]۔

معاصرین اور ہمچشموں کے مقابلے میں

عربی کا ایک مقولہ ہی المعاصرۃ سبب المنافرۃ یعنی ہمعصری باہم
نفرت کا باعث ہوتی ہی۔ یہ عادت قریباً طبیعت ہو چکی ہے کہ
جو ہم فن اہل کمال ایک ہی زمانے میں ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے
کے کمال کا اعتراف کماحقہ نہیں کرتے۔ الا ماشاء اللہ۔ جب ایک ہی عہد کے دو ہم فن

---

[1] شق۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۶۲ [2] شق۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۳۴

اہل کمال کے دل ٹٹولے جائیں تو اُن کی باہمی بے پروائی رقابت کے اثر سے کم وبیش پرخاش ومغائرت کی حد تک ترقی کیے ہوئے نظر آئے گی۔ شیخ سعدی کے زمانے میں ایک اور فارسی کا شاعر امامی ہروی تھا۔ اُس زمانے کے لوگ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہے کہ دونوں میں سے کون زیادہ باکمال ہی۔ چنانچہ ہمگر شیرازی ایک تیسرا شاعر اس بارے میں حَکَم قرار دیا گیا اور اُس نے امامی کو سعدی سے افضل بتایا۔ یہ ایسا غلط فیصلہ تھا جسکی غلط ہونے میں گزشتہ چھ سو برس کے عرصے میں شاید کسی کو کلام ہوا ہو۔ مگر معاصرت کے اثر نے ہمگر کو اس غلطی کا ادراک نہیں ہونے دیا۔ ہم جن علما کے حالات آپ کو سُنا رہے ہیں اُن کے جوشِ حق پرستی نے کبھی معاصرین کے فضل وکمال سے چشم پوشی نہیں کرنے دی۔ واقعات شہادت دے رہے ہیں کہ وہ بزرگ جوہر اور کمال کے پرکھنے والے تھے اور جن میں یہ جوہر ہوتا تھا۔ اُن کا معاصر، عمر میں چھوٹا، طبقے میں نیچا، مذہباً مخالف ہونا اُن کی قدر شناسی کو کم نہیں کرسکتا تھا۔ امام اعظم امام مالک سے عمر میں تیرہ برس بڑے تھے اور طبقے میں عالی لیکن جب اُن سے ملے تو اس ادب سے ملے جیسے چھوٹے بڑوں سے ملتے ہیں۔ شاعر مشہور ابو اسحٰق عقیدے کا صابئی تھا مگر جب وہ مرا تو محض قدر دانی کمال کے لیے ہاشمی نسب شریف رضی نے اس کا مرثیہ لکھا اور لوگوں کے طعن کی کچھ پروا نہیں کی۔ معاصرین کے فضل وکمال کا اعتراف اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہی کہ علی الاعلان اُنکو اپنے آپ سے زیادہ عالم وکامل بتائیں۔ اُن کی جلالت کے سامنے اپنی بے مائیگی کا اقرار کریں اور جب کوئی مشکل پیش آئے تو اُن سے اُس کے حل کر دینے کا سوال۔ یا آں کہ وہ ان کی تصانیف پر اعتراض کریں تو شکریہ ادا کیا جائے اور دعائے خیر سے یاد۔ ایک

سلہ ستارہ پرست ۱۲

موقع پر امام شعبی آنحضرت کے عہد مبارک کے جنگی معرکوں کا بیان کر رہے تھے۔ اتفاقاً حضرت ابن عمرؓ کا گزر اُسی راستے سے ہوا۔ امام ممدوح کا بیان سُنکر فرمایا کہ جس قوم کا یہ ذکر کر رہے ہیں میں اُس کے دیکھنے والوں میں ہوں لیکن مغازی یہ مجھ سے زیادہ اور بہتر جانتے ہیں۔[1] حضرت امام باقرؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ روئے زمین پر کوئی شخص حج کے مسائل عطا سے بہتر نہیں جانتا۔[2] حضرت امام زین العابدین اپنے ایک شاگرد زید ابن اسلم کے پاس جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ لوگوں نے اسپر تعجب ظاہر کیا تو پاک نفس امام نے فرمایا کہ جس کی صحبت میں دین کا نفع ہوتا ہی اُس کے پاس انسان بیٹھتا ہی ہی۔[3] ایک دفعہ کا ذکر سُنیئے کہ مدینہ طیبہ میں امام زُہری امام ربیعہ کا ہات پکڑ کر ایک مکان میں لے گئے اور دہاں دونوں نے ایک دوسرے کے علم کو جانچا۔ جب عصر کے وقت وہ دونوں امام زمانہ باہر تشریف لائے تو زہری تو یہ کہتے نکلے کہ ربیعہ کا مثل مدینہ میں نہیں اور ربیعہ یہ فرماتے آئے کہ زُہری کے رُتبے کو کوئی نہیں پہنچتا۔[4] ابن اسحٰق اِصفہانی جب بصرے گئے اور وہاں کے محدثین سے حدیث پڑھنی چاہی تو سب نے پوچھا کہ تمھارے شہر میں عباس ابن یزید نہیں ہیں۔ اُنھوں نے کہا ہیں تو فرمایا اُن کے ہوتے ہوئے تم ہمارے پاس کیوں آئے۔[5] اس واقعے سے واضح ہوتا ہی کہ اُس عہد مبارک میں افراد نہیں بلکہ گروہ کے گروہ حق کے گرویدہ تھے اور حُسنِ تعلیم نے سب کے مذاق یکساں پاک وصاف کر دیے تھے۔ امام عمرو ابن دینار امام زہری کے کمالات کا شہرہ سُن سُنکر فرمایا کرتے تھے کہ زُہری کے پاس دھرا کیا ہی۔ مینے ابن عمرؓ کو دیکھا ہی اُنھوں نے نہیں دیکھا مینے ابن عباسؓ کو دیکھا ہی اُنھوں نے نہیں دیکھا۔ اندازِ کلام صاف کہہ رہا ہی کہ ابن دینار کو کمال کا غرّہ زہری سے بیزار کر رہا تھا حُسنِ اتفاق کہ اسی

[1] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۷ [2] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۸۷ [3] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۱۹ [4] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۹۸ [5] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۸۶۔

عرصے میں امام زہری کا مکۂ مکرمہ میں گزر ہوا۔ جب ابن دینار نے یہ خبر سُنی تو باوجود پاؤں سے معذور ہونے کے فوراً ملاقات کو تیار ہوئے اور خدام سے فرمایا کہ مجھ کو امام زہری کے یہاں لے چلو۔ ملازموں نے تعمیل ارشاد کی اور امام ممدوح کی خدمت میں لے آئے جب ملے تو زیادہ گرویدہ ہوئے اور شب کو وہیں رہے۔ صبح کو واپس آئے تو شاگردوں نے سوال کیا کہ کہئے امام زہری کو کیسا پایا۔ اگلی رائے کو انصاف مغلوب کرچکا تھا فرمایا کہ واللہ ما رأیتُ مثلَ ھذا القرشی ابداً یعنی میں نے اس قرشی کا مثل کبھی نہیں دیکھا۔

مولانا ابن مؤید رومی جب محقق دوانی کے پاس گئے تو محقق نے اُنسے سوال کیا کہ روم سے ہمارے لیے کیا ہدیہ لائے۔ مولانا نے علامہ خواجہ زادے کی تازہ تصنیف کتاب تہافہ پیش کی۔ محقق نے اوقات فرصت میں مطالعہ کیا۔ جب تمام وکمال دیکھ چکے تو مولانا ابن مؤید سے فرمایا کہ خدا تعالےٰ تم کو اور اس رسالے کے مصنف کو جزائے خیر دے۔ میں بھی اس مبحث پر ایک کتاب لکھنے کے خیال میں تھا۔ مگر اللہ نے شرم رکھ لی۔ اگر میں اس کتاب کے دیکھنے سے پہلے لکھ چکا ہوتا تو میری بڑی ہنسی ہوتی۔ جب تک حضرت سالم ابن عبداللہ زندہ رہے امام نافع نے فتویٰ نہیں دیا۔ حضرت سعید ابن المسیب کے پاس جب کوئی حاجتمند فتویٰ پوچھنے جاتا تو امام ممدوح فرماتے کہ سلیمان ابن یسار کے پاس جاکر پوچھو۔ اس لیے کہ آج وہ سب سے زیادہ عالم ہیں۔ حضرت قاسم (ابن محمد ابن ابی بکرؓ) سے کسی نے پوچھا کہ آپ زیادہ عالم ہیں کہ سالم (ابن عبداللہ ابن عمرؓ) تو انھوں نے فرمایا کہ یہ مرتبہ سالم ہی کو حاصل ہے۔ فرائ نحوی اپنے ہم عصر اخفش اوسط سے ملنے گئے تو اخفش نے حاضرین سے کہا کہ تمھارے پاس لغت اور عربیت کا سردار آیا۔ فرّا نے کہا

لہ ابن۔ج ا صفحہ ۱۵۴ ۲ہ شق۔ج ا صفحہ ۱۰۵ ۳ہ تذ۔ج ا صفحہ ۸۸ ۴ہ ابن۔ج ا صفحہ ۲۱۳ ۵ہ ابن۔ج ا صفحہ ۱۸۱

کہ جب تک اخفش زندہ ہیں اُس وقت تک نہیں[1]۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو جب ضرورت پیش آتی تو وہ زر ابن حُبیش سے عربیت کے متعلق باتیں دریافت فرما لیا کرتے[2]۔ قابوس نے جب اپنے والد سے یہ سوال کیا کہ آپ صحابۂ کرام کی موجودگی میں علقمہ (تابعی) کے پاس کیوں جایا کرتے تھے تو اُنھوں نے جواب دیا کہ اس لیے جایا کرتا تھا کہ میں نے بعض صحابہ کو دیکھا تھا کہ وہ علقمہ کے پاس تشریف لیجاکر مسائل دریافت فرماتے تھے[3]۔ خواجہ حسن بصری کو جب کوئی مشکل پیش آجاتی تو بذریعہ تحریر حضرت سعید ابن المسیب سے دریافت فرما لیتے۔ امام ابو احمد کو فن حدیث میں ایک بار اشکال پیش آیا تو اُنھوں نے اپنے معاصر ابن مَندہ سے نیشاپور خط بھیجکر حل کر لیا[4]۔ حضرت ابن عمر اکثر امام مجاہد (تابعی) کے گھوڑے کی رکاب تھام لیا کرتے تھے[5]۔ اشہب ابن عبدالعزیز کہتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہؒ کو امام مالکؒ کے حضور میں ایسا مؤدب بیٹھا دیکھا جیسے چھوٹے بڑوں کے سامنے بیٹھتے ہیں[6]۔ امام اعظم امام مالک سے عمر میں تیرہ برس بڑے تھے اور طبقے میں بھی اُن سے عالی ہیں۔ اسی واسطے امام ذہبی واقعۂ بالا کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ " اس سے امام ابو حنیفہؒ کے حسن ادب اور تواضع کی کیفیت معلوم ہوتی ہے " اور حق یہ ہے کہ ان بزرگوں کی عظمت کے اصلی اسباب یہی صفات تھیں۔ حسن ابن علی کہتے ہیں کہ جب دحیم بغداد میں آئے تو میں نے اپنے والد۔ امام احمد ابن حنبل یحیٰی ابن معین اور ابن سالم کو اُن کے سامنے ایسا بیٹھا دیکھا جیسے بچے بیٹھے ہوں[7]۔ امام احمد ابن حنبل کے پاس ایک بار امام ذہلی آئے تو امام ابن حنبل اُن کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے دونوں اماموں کے رتبے میں اس قدر فرق تھا کہ لوگوں کو اس تعظیم سے حیرت ہوئی۔ امام ممدوح

---

[1] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۰۸ [2] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۴۹ [3] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۴۲ [4] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۴۷۔

[5] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۳۷ [6] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۸۰ [7] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۸۹ [8] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۶۴۔

نے صرف تعظیم پر کفایت نہیں کی بلکہ اپنے صاحبزادوں اور تلامذہ کو حکم دیا کہ اُن سے جاکر حدیث حاصل کریں[۱]۔ سفیان ابن عیینہ سے کسی نے کہا کہ شہر میں حسین ابن جعفی آئے ہیں۔ ابن عیینہ یہ سُنکر بے اختیار کھڑے ہوگئے اور فوراً ابن جعفی سے جاکر ملے اُن کے ہات چومے اور فرمایا کہ آج یہاں ایسا شخص وارد ہوا ہی جس کی فضیلت سب سے بڑھی ہوئی ہی[۲]۔ سُننے کے قابل یہ بات ہی کہ ابن عیینہ ابن جعفی سے بیس برس تو عمر میں بڑے تھے اور طبقۂ عالی۔ امام محمد اور امام شافعی میں جس قدر جزئیات میں اختلاف ہی ظاہر ہی با ایں ہمہ امام محمد جتنی امام شافعی کی تکریم کرتے تھے اُتنی کسی عالم کی نہیں کرتے تھے[۳]۔ امام بوشنجی کسی جنازے کی نماز پڑہانے تشریف لے گئے تھے جب واپس ہونے لگے تو امام ابو عمرو نے اُن کے گھوڑے کی باگ تھامی۔ امام ابن خزیمہ نے رکاب اور امام جارودی نے چارجامہ درست کیا[۴]۔ شیخ ابو اسحٰق شیرازی اپنے معاصر امام الحرمین سے ایک موقع پر یوں خطاب کر رہے تھے یا مفید اهل المشرقِ والمغربِ انت الیومَ اِمامُ الائمّۃ یعنی اے مشرق و مغرب کے لوگوں کو فائدہ پہنچانے والے۔ آج تم سارے اماموں کے امام ہو[۵]۔ حق پسندی کی انتہا یہ ہوتی ہی کہ حاکم نیشاپوری محدث مشہور نے فن حدیث میں ایک کتاب المدخل فی الصحیح لکھی تھی۔ امام عبدالغنی مصری نے اُس کا رد لکھا۔ حاکم نے جب یہ رد دیکھا تو امام مصر کی خدمت میں شکریے کا خط بھیجا اور اُن کے حق میں دعاے خیر کی[۶]۔ ذیل کی متفرق حکائتیں بھی ہمارے مدعا کو کسی نہ کسی پہلو سے ثابت کرتی ہیں۔ ابو اسحٰق شاعر مشہور نے جب وفات پائی تو شریف رضی نے مرثیہ لکھا۔ لوگ یہ سُنکر بگڑے اور کہا کہ افسوس ہے کہ

---

[۱] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۱۲ [۲] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۳۰۲ [۳] ابن۔ ج ا۔ صفحہ ۴۴ [۴] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۳۰

[۵] ابن۔ ج ا۔ صفحہ ۲۸۷ [۶] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۵۰۔

خاندان نبوت سے ہو کر اُنھوں نے ایک صابی کا مرثیہ لکھنا روا سمجھا۔ شریف ممدوح نے یہ اعتراض سُنا تو فرمایا اور کیا خوب فرمایا۔ انما رثیت فضلہ (میں نے تو اُس کے کمال کا مرثیہ لکھا ہے[1]) الحق ؎ إنما يعرف ذا الفضل من الناس ذووہ حضرت سہل ابن عبد اللہ تستری امام ابو داؤد کے پاس (جن کی سُنن داخل صحاح ستہ ہے) تشریف لے گئے۔ امام نے اُنکو اہلاً وسہلاً کہکر لیا اور تعظیم سے بٹھایا۔ جب حضرت ممدوح بیٹھ لئے تو امام موصوف سے فرمایا کہ میں ایک کام کے واسطے حاضر ہوا ہوں۔ ابو داؤد نے ارشاد کیا کہ فرمائیے حضرت سہل نے کہا کہ جب تک یہ وعدہ نہ ہو جائے کہ حتی الامکان میری درخواست مقبول ہوگی میں نہ کہوں گا۔ امام حدیث نے جب یہ منظور فرما لیا تو اُنھوں نے کہا کہ اپنی زبان جس سے احادیث نبویہ آپ نے روایت کی ہیں نکالیے تاکہ میں اُس کو چوم لوں۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی زبان نکالی اور انھوں نے چوم لی[2]۔ مبرّد اور ثعلب ادب کے دو مشہور اماموں میں بوجہ معاصرت چشمک تھی۔ جب مبرّد کے انتقال کی خبر سُنی تو ثعلب نے بہت تاسف کیا اور ایک دردناک مرثیہ لکھا جس کے بعض اشعار یہ ہیں ؎

ذهب المبرد وانقضت ايامه[3]	وليذهبن مع المبرد ثعلب
بيت من الآداب اضحى نصفه	خربا وباقي النصف منه سيخرب
فتزودوا من ثعلب فبكأس ما	شرب المبرد عن قريب يشرب

اُس زمانے کی حق پسندی کی ایک مثال خطیب بغدادی کے دفن سے متعلق ہے خطیب کا وقت وفات جب قریب ہوا تو اُنھوں نے وصیت کی کہ میری قبر بشر حافی کے مزار کے قرب میں

---

[1] ابن۔ج ا صفحہ ۱۳۔ [2] ابن۔ج ا صفحہ ۲۱۴ [3] مبرد گیا اور اُس کی زندگی کے دن گزر گئے ٭ مبرد کی رفاقت میں ثعلب بھی ضرور جائیگا ٭ ادب کا گھر آدھا تو ویران ہوگیا ٭ جو آدھا باقی ہے وہ بھی خراب ہوا چاہتا ہے ٭ ثعلب کا دم غنیمت سمجھو کہ جو تلخ گھونٹ مبرد نے پیا ہے وہی ثعلب بھی عنقریب پینے والا ہے ۱۲ [4] نزہتہ صفحہ ۲۹۳ و ۲۸۷

بنائی جائے۔ بعد وفات محدثین نے ہرچند تلاش کی مگر کوئی جگہ اُس بابرکت قبر کے قریب نہ ملی صرف ایک لحد تھی جو صوفی ابن زہرا نے حالت حیات میں اپنے واسطے طیار کرائی تھی۔ ہر ہفتہ ایک بار وہ اُس میں جاکر لیٹتے اور کلام مجید ختم کرتے جس کنج مزار کو اس محنت سے اُنھوں نے پاک بنانا چاہا تھا خطیب کے وصیّوں نے آخر اُسی کو تاکا اور ان سے استدعا کی۔ ظاہر ہی کہ یہ کب قبول کرتے۔ وہ بزرگ گروہ مایوس ہوکر اُن کے والد کے پاس گیا اور حال بیان کیا۔ باپ نے بیٹے کو بُلا بھیجا۔ جب یہ آئے تو کہا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ قبر دیدو۔ مگر ایک بات پوچھتا ہوں۔ فرض کرو کہ تم کسی موقعے پر بشر حافی کے پاس بیٹھے ہوتے اور خطیب وہاں آتے تو تم کیا پسند کرتے کہ خطیب تم سے پائیں میں بیٹھ جائیں۔ ابن زہرا نے کہا نہیں میں اپنی جگہ اُن کے واسطے خالی کر دیتا۔ نکتہ شناس باپ نے کہا کہ بس یہی معاملہ بعد رحلت ہونا چاہیے۔ صاف دل صوفی کے دل میں یہ بات اثر کر گئی اور اُنھوں نے وہ قبر بطیب خاطر دیدی[1]۔ عفان ابن مسلم محدث انصاری کو ایک دفعہ دس[2] ہزار اشرفیاں اِس غرض سے دی گئیں کہ فلاں شخص کی نسبت وہ قاضی کی عدالت میں جرح و تعدیل نہ کریں۔ مگر اُنھوں نے فرمایا کہ میں کسی کے حق کو باطل نہیں کرسکتا اور یہ کہکر اشرفیاں واپس کر دیں[3]۔

اپنے نفس کے مقابلے میں

یہ بیان عنوان حق پسندی کا اگرچہ آخری حصہ ہی لیکن اہمیت اور دشواری میں پچھلے دونوں بیانوں سے بڑھا ہوا ہی۔ برہنہ شمشیر کے مقابلے میں حق کو نہ چھوڑنا اتنا مشکل نہیں ہی جتنا یہ مشکل ہی کہ انسان اپنے نفس کی بُرائیاں از راہ انصاف قبول کرلے یا آنکہ ایک شہرۂ آفاق باکمال اپنے ایک معاصر کے فضل و علم سے اپنے علم و فضل کو کم مان لے۔ اولاد اور جان دنیا میں بہت عزیز

---

[1] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۱۳۔ [2] ایک اشرفی اگر دس روپیہ کی رکھی جائے تو ایک لاکھ روپے ہوتے ہیں ۱۲ [3] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۳۴۸

چیزیں ہیں مگر جو اولاد نافرمان ہو جاتی ہے وہ دشمن سے زیادہ بُری معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور
زندگی جب دل کو ستانے لگتی ہے یا کوئی حالت ایسی پیش آجاتی ہے جس کا نفس متحمل نہیں ہو سکتا
تو انسان بیدھڑک اپنی حیات کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ تاریخ میں ایک ایسے جوانمرد پادشاہ کا ذکر
ہے جس نے آٹھ ہزار فوج سے اسی ہزار جرار فوج کے مونہہ پھیر دیئے تھے اور اُس وقت اُسکی
عُمر صرف اٹھارہ برس کی تھی لیکن یہ اولوالعزم فرماں روا اپنے نفس کے مقابلے میں ہمیشہ
مغلوب رہا۔ یکے بعد دیگرے فاحش غلطیاں اُس نے کیں اُس کے مشیر سر دُھنتے رہے مگر کبھی
اُس سے یہ نہو سکا کہ اپنی غلطیوں کو غلطی مان کر راہ صواب اختیار کر لیتا۔ آفریں ہے اُن علمائے
سلف پر جنھوں نے اپنے نفس کی خود پسندی کو قابو میں رکھا اور کبھی حق پر غالب نہیں
ہونے دیا۔ فقہ کی کتابیں اس کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں کہ اُمّت کے پیشوا اماموں نے
کسی مسئلے میں اپنی ایک رائے ظاہر کی اور عقیدت کی مدد سے وہ مشرق و مغرب میں پھیل
گئی اور سارے عالم میں اُسپر عمل ہونے لگا۔ پھر جب اُن کو اپنی رائے کی غلطی محسوس ہوئی
تو علی الاعلان اس کو چھوڑ دیا۔ اس کی نظیریں ابھی عرض کیجائیں گی کہ بڑے بڑے جلیل القدر
اماموں نے اپنے شاگردوں کی شاگردی کی ہے۔ ایسے بھی پاک نفس بندے تھے جو کسی فن
یا علم میں مشہور روزگار ہوتے تھے اور جب اُن کے سامنے اُسی علم کا کوئی ایسا سوال پیش
کیا جاتا جس کا جواب انھیں معلوم نہوتا تو وہ بدون کسی پس و پیش کے سائل سے فرما دیتے
تھے لا ادری یعنی میں نہیں جانتا۔ امام شافعی جن کی رائے پر لاکھوں نہیں کروروں آدمیوں
نے اپنے دین اور دنیا کو چھوڑ دیا ہے اپنی عقل و رائے کی نسبت یہ فرماتے ہیں ؎

کلما ادبنی الدھر ارانی نقص عقلی
واذا ما ازددت علماً زادنی علمی بجھلی

یہ باتیں کہنے کو تھوڑی اور چھوٹی ہیں مگر کرنے کو بڑی ہیں اور بہت بڑی۔ سلیمان ابن یسار

فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس دونوں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں
حضرت ابن عمر اکثر سوالوں کے جواب میں لا ادری فرما دیتے تھے مگر حضرت ابن عباس
کسی سائل کو مایوس نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اُن کو تعجب آتا تھا کہ عبداللہ ابن عمر کیوں لا ادری
کہکر لوگوں کو ناکام واپس کر دیتے ہیں۔ اور فرماتے تھے کہ جو مسئلہ مشتبہ پیش آئے اُس میں
اول تو سُنت کو تلاش کرنا چاہیے اور اُس کے مطابق حکم دینا اور اگر صریح سُنّت نہو تو اپنے
اجتہاد سے مدد لیں۔ اتفاق زمانہ کہ ایک روز کوئی مسئلہ اُن کے سامنے ایسا پیش ہوا جس کے
جواب میں حضرت ممدوح متحیر رہ گئے۔ اُس وقت اُن کو اپنا وہ مقولہ یاد آیا جو حضرت ابن عمر
کے مقابلے میں فرمایا کرتے تھے۔ اور ازراہ انصاف ارشاد کیا کہ اَلْبَلاءُ مُوَکَّلٌ بِالْقَوْلِ[۱]+
حدیث کے عالی مرتبہ امام شعبی بھی اکثر سوال کے وقت لا ادری کہدیتے تھے۔ اُنکا قول
ہے کہ ہم فقیہہ نہیں ہیں۔ ہم نے تو بس یہی کیا ہے کہ جو حدیث سُنی اُس کو روایت کر دیا۔ فقہا
وہ ہیں جو علم پر عمل بھی کرتے ہیں[۲]۔ جلیل القدر تابعی حضرت عطا کے پاس ایک روز ابن ابی
لیلیٰ گئے تو حضرت عطا نے اُن سے بعض مسائل ازراہ استفادہ دریافت کیے۔ جو لوگ
اُن کی شان امامت سے واقف تھے اُن کو تعجب ہوا۔ کہ ابن ابی لیلیٰ سے عطا استفادہ
کریں۔ حضرت عطا نے سُنا تو فرمایا کہ حیرت کیا ہے۔ ابن ابی لیلیٰ مجھ سے زیادہ عالم ہیں[۳]۔ اُن
بزرگوں کی پاک نفسی اس سے معلوم ہوتی ہے کہ اپنے شاگردوں کے مقابلے میں اپنے علم و
کمال کو کمتر سمجھتے تھے۔ ابن عیینہ نے اپنے شاگرد علی ابن مدینی کی نسبت ایک مرتبہ فرمایا
کہ لوگو تم مجھ کو ابن مدینی کے ارتباط پر ملامت کرتے ہو۔ واللہ وہ مجھ سے جتنا علم حاصل کرتے
ہیں اُس سے زیادہ میں اُن سے سیکھ لیتا ہوں[۴]۔ یحیٰی ابن معین اپنے شاگرد امام ابن حنبل کی نسبت

---

[۱] بولنا بلا میں ڈالتا ہے [۲] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۷۳ [۳] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۹۴، [۴] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۵۴ [۵] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۱۶۔

فرماتے ہیں کہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ میں مثل احمد ابن حنبل کے ہو جاؤں۔ قسم ہے اپنے رب کی میں اُن کے مرتبے کو نہیں پا سکتا[۱]۔ حماد ابن زید کا اپنے معاصر شعبہ کے بارے میں یہ قول تھا کہ جب حدیث میں میری اور شعبہ کی رائے میں مخالفت آ پڑتی ہے تو میں اپنی رائے چھوڑ کر شعبہ کا قول اختیار کر لیتا ہوں۔ اس لیے کہ شعبہ شیخ سے ایک حدیث بیس دفعہ سُنکر بھی سیر نہیں ہوتے تھے اور میں ایک بار کے سُن لینے پر قانع ہوں[۲]۔ امام شعبہ فرماتے تھے کہ سفیان احفظ منی یعنی سُفیان کو مجھ سے زیادہ حدیثیں یاد ہیں۔ اُن کے عہد میں اس فنِ پاک کا کمال حفظ پر موقوف تھا لہذا امام شعبہ کا حضرت سفیان کو اپنے آپ سے زیادہ حافظ حدیث بتانا گویا یہ کہنا ہے کہ وہ زیادہ عالم ہیں[۳]۔ امام اوزاعی شام کے مقتدا ایک روز امام فزاری کو خط لکھوانے لگے تو کاتب سے فرمایا کہ اوّل[۴] اُن کا نام لکھنا اس لیے کہ واللہ وہ مجھ سے بہتر ہیں[۵]۔ خواجہ حسن بصری نے کسی موقع پر بیان فرمایا تھا کہ منافق کو تین علامتوں سے پہچان لیا کرو۔ جب وہ بات کہے تو جھُوٹ بولے۔ کسی کی امانت رکھے تو خیانت کرے وعدہ کرے تو خلاف وعدگی کرے۔ حضرت عطا نے اُن کا یہ قول سُنا تو اعتراض کیا کہ حضرت یعقوبؑ کے فرزندوں میں یہ تینوں صفتیں تھیں۔ اُنھوں نے جھوٹ بولا۔ امانت میں خیانت کی اور وعدہ خلافی بھی کی۔ با ایں ہمہ خدا تعالےٰ نے اُن کو نبوت کا درجہ بخشا۔ لگانے والے تو بُرے ہوتے ہیں کسی نے حضرت عطا کا یہ اعتراض خواجہ صاحب کے کان ڈال دیا۔ پاک نفس خواجہ نے یہ سُن کر از راہ انصاف فرمایا کہ وفوق[۶] کُلّ ذی علمٍ علیم[۷] لوگوں کو یہ سُنکر حیرت ہو گی کہ ہمارے امام ابو حنیفہ کی (جن کو دربار فضل سے امام اعظم کا خطاب ملا ہی) ایک اوّلی پیشہ در حجام نے

---

[۱] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۹ [۲] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۷۵ [۳] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۸۴ [۴] عربی میں خط کے آغاز میں لکھتے ہیں من فلان الی فلان یعنی فلاں شخص کی جانب سے فلاں شخص کو ۱۲ [۵] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۲۴۹ ۔ [۶] ہر ذی علم سے بڑھ کر ایک عالم ہے ۱۲۔ [۷] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۱۹ ۔

پانچ غلطیاں پکڑی تھیں۔ امام اعظم نے اُس حجام کی یہ قدر کی کہ اس واقعے کو خود سُنا کر قیامت تک اُس کا نام کر دیا۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ ایام حج میں میں نے ایک حجام سے حجامت بنوانے کا قصد کیا۔ جب میں اُس سے اُجرت ٹھہرانے لگا تو اُس نے کہا کہ مناسک[1] کی اُجرت نہیں ٹھہرائی جاتی۔ اُس نے جب حجامت بنانی شروع کی تو میرا مونھ قبلے کی جانب نہ تھا۔ اسپر حجام نے کہا کہ قبلہ رُخ ہو بیٹھو۔ میں نے بائیں طرف سے حجامت بنوانے کا ارادہ کیا تو بولا کہ حجامت سیدھی جانب سے اول بنوائی جاتی ہی۔ وہ اپنے کام میں مشغول تھا اور میں خاموش اُس پر اُس نے ہدایت کی کہ تکبیر پڑھتے جاؤ۔ حجامت سے فارغ ہو کر میں اُٹھ کر چلا تو میرے مہربان نے پوچھا کہ کہاں چلے۔ میں نے کہا کہ اپنی فرودگاہ پر جاتا ہوں یہ سُنکر اُس نے کہا کہ اول دو رکعتیں پڑہ لو پھر قیام گاہ کا قصد کرنا۔ اب تو مجھ سے نہ رہا گیا اور مینے پوچھا کہ یہ باتیں تم کو کس نے بتلائی ہیں۔ حجام نے جواب دیا کہ میں نے حضرت عطا کا طریق عمل ایسا ہی دیکھا تھا[2]۔ ایمہ حدیث کے حالات میں اس کی مثالیں کثرت سے ہیں کہ جب اُن کے شاگرد شیخ بنے تو اُنھوں نے اُن سے حدیثیں حاصل کیں۔ بلکہ محدثین کا یہ قول ہی کہ انسان اُس وقت تک محدث نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اعلیٰ۔ ہمسر اور کمتر تینوں طبقوں سے روایت نہ کرے[3]۔ بطور نمونہ ہم چند مثالیں ذیل کے نقشے میں لکھتے ہیں۔

نمبر	نام امام	نام شاگرد کا جس سے حدیث روایت کی	نمبر	نام امام	نام شاگرد کا جس سے حدیث روایت کی
۱	علقمہ	مقاتل (تذ۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۵۷)	۵	ابوحنیفہ	ابراہیم ابن طہمان (تذ۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۹۲)
۲	اعمش	سفیان ابن عیینہ (تذ۔ جلد ۱۔ صفحہ ۲۳۹)	۶	لیث	عبداللہ ابن وہب (تذ۔ جلد ۱۔ صفحہ ۲۷۸)
۳	ابن جریج	” ”	۷	بخاری	عبداللہ ابن حماد (مقدمہ صفحہ ۵۶۵)
۴	شعبہ	” ”	۸	خطیب بغدادی	ابن ماکولا (تذ۔ جلد ۴۔ صفحہ ۲)

[1] وہ اعمال جو حج سے تعلق رکھتے ہیں ۱۲ [2] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۱۹ [3] مقدمہ صفحہ ۵۶۵

احمد ابن سلمہ کہتے ہیں کہ میں نے اسحٰق ابن راہویہ کو یہ کہتے سُنا کہ خدا تعالیٰ حق کو پسند فرماتا ہی لہذا میں کہتا ہوں کہ ابو عبید (بغدادی) مجھ سے علم میں بڑھ کر اور فقہ میں زیادہ۔ ہم ابو عبید کے محتاج ہیں مگر اُن کو ہماری احتیاج نہیں[1]۔ جب سلیمان حافظِ حدیث بغداد میں وارد ہوئے اور امام احمد ابن حنبل نے اُن کی آمد کی خبر سُنی تو حاضرین سے فرمایا کہ چلو سلیمان سے راویانِ حدیث کا پرکھنا سیکھیں[2]۔ امام ممدوح اور سلیمان کی جلالتِ شان میں جو فرق بیّن تھا وہ محتاج بیان نہیں۔ ایک عالم محدث کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ ابن مَعین کا یہ مقولہ سُنا تھا کہ ہم راویانِ حدیث پر جرح کر رہے ہیں حالانکہ ممکن ہی کہ وہی لوگ دو سو برس سے بہشت میں آسودہ ہوں۔ ایک روز میں ابن ابی حاتم کی خدمت میں گیا تو وہ فن رجال کا درس دے رہے تھے مینے امام ممدوح کا قولِ مذکور اُن کو سُنایا۔ اُن پر اس مقولے کا یہ اثر ہوا کہ رونے لگے ہاتوں میں رعشہ آگیا اور کتاب ہات سے چھُوٹ پڑی۔ زار زار روتے تھے اور بار بار مجھ سے اس روایت کو کہلواتے تھے[3]۔ ایام طالب علمی میں ایک وز امام دارقطنی ابن انباری کی مجلس درس میں شریک ہوے دورانِ املا میں ابن انباری نے ایک نام میں غلطی کی۔ دارقطنی کو اتنی جبارت تو نہوئی کہ ابن انباری کو متنبہ کرتے مگر اُن کے مستملی کو وہ غلطی جتادی۔ جب دوسرے جمعے کو دارقطنی پھر مجلس مذکور میں گئے تو ابن انباری نے باعلان فرمایا کہ ہم نے اُس روز فلاں نام میں غلطی کی تھی اس نوجوان نے ہم کو آگاہ کر دیا[4]۔ جوشش حق پسندی اس کو کہتے ہیں۔ اگر ابن انباری اس راز کو فاش نکرتے تو شاید دنیا کو اس کی خبر بھی نہوتی۔ مگر اُنھوں نے یہ خیال فرمایا کہ اپنی ایک خطا ظاہر ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ جو نوجوان طالب علم دل بڑہاے جانے کا مستحق ہی اُس کی حق تلفی نہونی چاہیئے حافظ ابن خیرون کو کسی نے حافظ لکھا تو وہ بگڑ گئے اور فرمایا کہ میری کیا ہستی ہی جو مجھ کو حافظ

---

[1] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۶ [2] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۷ [3] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۵۰ [4] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۶۔

لکھا جائے۔ آج کل کے محمد فاضل اپنے نام کے اول میں مولوی لکھا دیکھتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ حق بحقدار رسید۔ آل سلجوق کے بلند پایہ وزیر نظام الملک طوسی نے جو نظامیہ مدرسہ بغداد میں قائم کیا تھا اُس میں شیخ ابو اسحٰق شیرازی اور امام حجۃ الاسلام غزالی جیسے اکابر مدرس رہے تھے۔ فخر الاسلام شافعی جب اُس کے مدرس مقرر ہوئے تو پہلے روز مسند تدریس پر متمکن ہونے کے بعد اُن اکابر کا خیال آیا جو اُس مسند کی عزت بڑھا چکے تھے۔ اس تصور نے اُن کے پاکیزہ قلب پر ایک کیفیت طاری کر دی۔ عمامہ آنکھوں پر رکھ کر بے اختیار روئے اور یہ شعر پڑھا ؎

خلت الدیار فسدت غیر مسوّد ومن العناء تفردی بالسودد

یعنی ملک اہل کمال سے خالی ہو گیا اور میں جو شایان سرگروہی نہ تھا۔ سرگروہ بنا۔ میرا سرگروہ یگانہ بننا کیسا اندوہ فزا ہے[1]۔ ادب عربی میں جو مرتبہ اصمعی کا ہے اُس سے ایک زمانہ واقف ہے باوجود کلام عرب کے دقائق سے واقف ہونے کے یہ امام ادب کلام اللہ اور حدیث کے معنی بیان کرنے سے بہت بچتا تھا۔ جب اس قسم کا سوال کیا جاتا تو اصمعی جواب دیتا کہ عرب اس لفظ کے یہ معنی لیتے ہیں مگر میں نہیں کہہ سکتا کہ کتاب و سنت میں کون سے معنی مراد ہیں[2]۔ امام ادب ابو العباس ثعلب کے پاس ایک شخص آیا اور کسی علمی مسائلے کا جواب چاہا۔ ثعلب کو چونکہ وہ مسائلہ معلوم نہ تھا اس لیے جواب میں لا ادری کہدیا۔ وہ بیچارہ اس امید پر آیا تھا کہ اُن کی پاس مشکل حل ہو جائے گی۔ یہاں جو یہ صاف جواب سُنا تو بہت جھنجھلایا اور کہا کہ حضور کی یہ تو شہرت ہی کہ لوگ سفر کر کے حاضر ہوتے ہیں۔ اور علم کا یہ حال کہ ایک ذرا سے سوال کے جواب میں لا ادری ارشاد ہوتا ہی۔ ثعلب نے ازراہ ظرافت کہا کہ میرے پاس جتنی لا ادریاں ہیں اگر تمھارے پاس اُتنے اونٹ ہوتے تو تم بڑے مالدار ہو جاتے[3]۔ متنبی مشہور شاعر کا واقعہ قبل اس بات کی کہ اُن

[1] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۸ [2] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۴۶۵ [3] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۲۸۹ [4] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۳۰۔

دونوں سچی بات دلوں پر کیا اثر کرتی تھی ایک بےنظیر مثال ہے۔ شاعر مذکور اپنے وطن کوفہ کو واپس آرہا تھا۔ بغداد کے سواد میں پہنچا تو خونخوار قزاقوں نے حملہ کیا۔ اول تو متنبی مع رفقا کے خوب لڑا مگر پھر جان بچاکر بھاگا۔ اُس کے دلیر غلام نے آقا کو بھاگتا دیکھکر کہا کہ جس شخص کا یہ شعر ہو حیف ہے کہ لوگ اُسکی نسبت بھاگنے کا تذکرہ زبان پر لائیں ؎ فالخیلُ واللیلُ والبیداءُ تعرفُنی والحربُ والضربُ والقرطاسُ والقلمُ[۱] متنبی یہ سُنکر میدان کی طرف لوٹ پڑا اور اتنا لڑا کہ اُسی جگہ کام آگیا[۲]۔ ابو العلاء اور ابن ابی اسحٰق دونوں فن ادب کے مشہور امام تھے۔ ایکبار نحو کے علم میں اُن میں باہم مناظرہ ہوا تھا کسی موقع پر ابوالعلاء نے یونس نحوی سے اس مناظرے کا تذکرہ کیا تو صاف دلی سے اعتراف کیا کہ اُس مناظرے میں ابن ابی اسحٰق قاعدہ ہمزہ میں مجھ پر غالب آگئے تھے اِس فصل پر میں نے بعد کو غور کیا ہے[۳]۔ ابوزید انصاری سے کسی نے پوچھا کہ فلاں موقع پر تم محزرق بولتے ہو اور ابوعمرو محرزق صحیح کونسا لفظ ہے۔ ابوزید نے کہا کہ چونکہ ابوعمرو کی والدہ نبطی ہیں اور یہ لغت بھی نبطی ہے اس لیے ابوعمرو کا قول زیادہ مستند ہے[۴]۔ شعرا اپنی بددماغی اور بےنیازی میں ضرب المثل ہیں۔ اُن کی نازک مزاجی دوسروں کے کمال کے سامنے سر جھکانے کو گوارا نہیں کرتی۔ جس قرن کا ذکر ہم کر رہے ہیں اُس کے اثر نے شاعروں کو بھی اچھوتا نہیں چھوڑا تھا۔ ابوالعتاہیہ ایکدفعہ اپنے معاصر بشار سے ملنے گئے اور اثنائے کلام میں بشار سے کہا کہ تمھارے یہ شعر اعتذار بکا میں مجھ کو نہایت پسند ہیں ؎ کم من صدیق لی اسا + رقہ البکاء من الحیاء واذا تفطن لامنی فاقول مالی من بکاء لکن ذھبت لارتدی فطرفت عینی بالرداء بشار نے کہا کہ اس مضمون میں تقدم کا شرف آپ کو حاصل ہے اور میں کاسہ لیس ہوں میرا شعر

---

[۱] گھوڑا۔ رات۔ جنگل۔ حرب۔ ضرب اور کاغذ و قلم یہ سب مجھ کو خوب پہچانتے ہیں ۱۲ [۲] ابن خ ا صفحہ ۳۰ [۳] نزہت صفحہ ۲۳
[۴] نزہت صفحہ ۱۲۴

آپ ہی کے دریا کا قطرہ ہی چنانچہ آپ نے کہا ہی؎ فقالوا قد بکیت فقلت کلا + وھل
تبکی من الجزع الجلید + ولکن قد اصاب سواد عینی + عوید قذی له طرف حدید
فقالوا ما لدمعهما سواء + اکلتا مقلتیك اصاب عود[1] ایک روز مولانا شمس الدین رومی
سے کسی نے کہا کہ شیخ ابن الوفا مولانا خسرو کے پاس تو جاتے ہیں مگر آپ کے پاس نہیں
آتے مولانا نے جواب دیا کہ حق بجانب شیخ کے ہی۔ مولانا خسرو عالم باعمل ہیں اس لیے قابل
زیارت ہیں۔ میں نے اگرچہ علم پڑھا ہی مگر سلاطین کی صحبت میں بیٹھتا ہوں اس واسطے قابل
زیارت نہیں رہا[2]۔

[1] (ابن ج ۱ ص ۷۳) [2] (ستق ج ۱ ص ۹۴)

عنوان سوم

اختلاف و اتفاق

اس عنوان کے قائم کرنے سے ہمارا مقصود یہ عیاں کرنا ہی کہ علمائے سلف کا اُن عالموں کے مقابلے میں کیا عمل رہا ہی جو اُن سے عقائد یا جزئیات مسائل میں مخالف تھے۔ زیادہ صاف لفاظ میں یہ سمجھیے کہ علمائے اہل سنت و جماعت کا سلوک دوسرے اہل قبلہ (مثلاً شیعہ و خارجی و مرجیہ و قدری) علما کے ساتھ کیا تھا اور خود اہل سُنت و جماعت کے مختلف فرقوں کے عُلما کس قسم کا برتاؤ باہم رکھتے تھے۔ آیا عقائد کا اختلاف ایسی حد فاصل خیال کیا جاتا تھا جو ایک کو دوسرے کی صورت سے بیزار۔ اُس کی خوبیوں کا منکر۔ اور اُس کے ساتھ ارتباط کو ایمان میں خلل انداز سمجھنے والا بنا دیتا۔ یا آنکہ وہ ردارت عقیدہ کو بُرا سمجھ لینے کے بعد اُن کو ثقہ و صالح جانتے۔ اُنسے احادیث روایت کرتے اور اُن کے علم و فضل کے حاضر و غائب عقیدتمند رہتے تھے۔ یہ بات سب کے نزدیک مسلّم ہی کہ سچّا اسلامی جوش اور خالص دینی حمیت قرون خیر پر ختم تھی۔ اور نبوّت کے عہد پاک کے قرب کی وجہ سے جو آثار صلاح و رشد ابتدائی صدیوں میں تھے وہ بعد کو باقی نہیں رہے۔ الّا ماشاء اللہ۔ اسی وجہ سے اُن بزرگوں کے طریقے اور مسلک کو عین صراطِ مستقیم اور ٹھیک راہ دین مانا جاتا ہی۔ پس ہمارا حال و خیال اگر سلف صالحین کے حال و خیال کے خلاف ہی تو ہمکو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم راہِ صواب سے دُور جا پڑے ہیں۔ یہ بات طریقۂ حق سے بعید ہوگی کہ ہم اُن کے شیوے کو اپنے

مسلک کے مخالفت دیکھکر از راہ تعصب خلاف حق سمجھیں اور اپنے ہی خیال باطل کو عین دینداری تصور کریں ہم نے اس باب میں یا تو تابعین و تبع تابعین کے اقوال و افعال کا حوالہ دیا ہی یا اُن علمائے مابعد کے اقوال و افعال کا جو بالاتفاق پیشوائے ملّت مانے گئے ہیں اور مزید احتیاط یہ کی ہی کہ یہ حالات اور اقوال بھی صرف بحوالہ امام ذہبی نقل کیے ہیں جو فن رجال و اسانید کے مستند امام خیال کیے جاتے ہیں۔ ایک واقعہ بحوالہ کشف الاسرار البتہ نقل کیا ہی۔ اصل مبحث پر بحث کرنے سے پیشتر یہ دیکھنا مناسب ہوگا کہ اگلے علمائے ربانی مذہبی جھگڑوں اور دینی نزاعوں کو کیسا خیال فرماتے تھے۔ آیا اُن کو تمام اصول دین اور ارکان مذہب سی زیادہ مُہتمّم بالشان اور لائق اہتمام سمجھتے تھے یا اُن کو نفرت کی نظر سے ملاحظہ فرماتے اور بربادی و تباہی کا ایک ذریعہ تصور کرتے تھے۔ ذیل کے اقوال صاف صاف ثابت کر دیں گے کہ وہ قدسی گروہ ہمیشہ ان سے بیزار رہا۔ امام ششم حضرت جعفر صادق ارشاد فرماتے ہیں۔ ایاکم والخصومة فی الدین فانها تشغل القلب و تورث النفاق یعنی بچو دین میں جھگڑا کرنے سے اسواسطے کہ وہ دل کو کام کی باتوں سے باز رکھتا ہی اور نفاق پیدا کر دیتا ہی صدقت یا ابن رسول اللہ جس بات سے بارہ سو برس پیشتر امام روشنضمیر نے مسلمانوں کو ڈرایا تھا آج اُس کے دردناک نتیجے اہل دین کے سامنے ہیں۔ اگر اس مقولے پر عمل رہتا تو مسلمانوں کی تاریخ میں بہت سے شرمناک صفحے نہ لکھے جاتے۔ امام اعظم فرماتے ہیں کہ مجھ کو علم کلام میں عجب ملکہ عطا فرمایا گیا تھا۔ اور ایک زمانہ دراز تک میرا یہی مشغلہ رہا۔ چونکہ شہر بصرہ اس قسم کے مباحثہ کرنیوالونکا مرکز تھا اس لیے میں بیس دفعہ سے زیادہ وہاں گیا اور کبھی ایک برس اور کبھی اس سے کم کبھی اس سے زائد وہاں مقیم رہا۔ معتزلہ اور خوارج وغیرہ کُل فرقوں سے میرے مباحثے رہے اور الحمد للہ میں نے سب کو مغلوب کیا۔ بعض خاص فرقوں کا کوفے میں مجمع تھا اُن سے میں وہاں بحث کرتا

اور غالب آتا۔ اُس زمانے میں علم کلام کو میں سب علوم سے افضل و اعلیٰ سمجھتا تھا جب میری عمر کا ایک حصّہ اس میں صرف ہو چکا تو میں نے ایک دفعہ دل میں کہا اور سوچا کہ صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین ہم سے زیادہ ان باتوں کو سمجھنے اور جاننے والے تھے اور حقائق اُمور کو ہم سے زیادہ پہچانتے تھے مگر اُنھوں نے کبھی ان باتوں میں جھگڑا اور خوض نہیں کیا بلکہ اس سے خود باز رہے اور دوسروں کو شدّت کے ساتھ منع کیا۔ میں نے اُنکا غور و خوض شریعت کے معاملات اور فقہ کے مسائل میں پایا۔ انھیں میں وہ بحث کرتے تھے اور اسی کی ترغیب دیتے تھے سلف کا دَورِ اول اسی پر ختم ہو گیا۔ تابعین نے اسی خصلت کی پیروی کی۔ ان بزرگوں کے ان حالات کا انکشاف ہوتے ہی میں نے منازعت اور علم کلام میں غور و خوض کرنا چھوڑ دیا اور سلف صالحین کے طریقے کو اختیار کر کے وہی کام کرنے شروع کیے جو وہ کرتے تھے۔ اور ایسے ہی لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے لگا۔ اس کے ساتھ میں نے یہ بھی دیکھا کہ جو لوگ علم کلام کے مدعی ہیں اور اُس میں جھگڑتے ہیں اُن کی شان سلف کی شان کے اُن کا طریقہ سلف کے طریقے کے خلاف ہی۔ میں نے اُن کے قلوب میں قساوت اور دلوں میں شدت پائی وہ کتاب و سنت اور سلف صالحین کی مخالفت کی پروا نہیں کرتے۔ یہ دیکھکر میں نے اُنکو چھوڑ دیا۔ اور اس پر میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ انتہیٰ خلاصۃً (کشف جلد اول صفحہ ۹ و ۱۰) یہ دوسری صدی کے مناظرے اور مناظرین کا حال تھا۔ آج کل کے مناظرے اور مناظرہ کرنے والوں کے حال کا قیاس اسی پر فرما لیجیے۔ شام کے مقتدا امام اوزاعی کا (جو تبع تابعی ہیں) قول ہی کہ اذا اراد اللہ بقوم شراً فتح علیھم الجدل و منع عنھم العمل۔ یعنی جب کسی قوم کی بربادی خدا تعالیٰ کو منظور ہوتی ہی تو اُن پر جھگڑے کے دروازے کھول دیتا ہی اور عمل سے باز رکھتا ہی مطلب یہ کہ جب تم دیکھو کہ ایک قوم جھگڑنے میں بہت چست ہی اور عمل میں سُست تو سمجھ لو کہ خدا کی

بھیجی ہوئی تباہی اُس پر آ رہی ہی۔ ایک دوسرے تبع تابعی امام حجاج ابن ارطاۃ فرماتے ہیں
کہ ماخاصمت قط ولاجلست الی قوم یختصمون یعنی مینے کبھی کسی سے جھگڑا نہیں کیا اور نہ
کبھی ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھا جو جھگڑالو ہوں اس قول سے پتا لگتا ہی کہ امام حجاج کے
نزدیک کسی شخص یا فرقے سے بیزار اور اُن کی مجالست سے متنفر کر دینے والی کیا صفت
ہوسکتی ہی۔ آپ اگر اس مقولے کو آیندہ کے واقعات سے ملائیں گے تو ایک اہم نتیجہ حاصل ہوگا
ان اقوال کو پڑھ کر ایک خلجان طبیعت کو پیدا ہوتا ہی کہ یہ بات واضح طور پر ثابت ہی کہ ائمہ
دین نے ہمیشہ طریقہ باطل کی تردید اور راہ صواب کی تائید فرمائی ہی۔ اور اُن کے مناظرے
معتزلہ وغیرہ فرقوں کے علما کے ساتھ تاریخ و فن کلام میں مذکور ہیں۔ پھر کیونکر مذہبی مُباحثوں
کو مُورثِ نفاق اور باعثِ بربادی کہا جا سکتا ہی۔ اس شبہے میں ایک افسوس ناک خلط مبحث
ہی اور وہ یہ ہی کہ اختلاف و خصومت میں فرق نہیں کیا جاتا۔ اور ہم علماے سلف کے اختلاف
کو اپنی نزاعوں پر قیاس کرتے ہیں۔

حضرت یحییٰ ابن سعید جو اکابر تابعین میں ہیں کس خوبی سے اختلاف و نزاع کا امتیاز
ظاہر فرماتے ہیں اُنھوں نے فرمایا ہی کہ اھل العلم اھل توسعة وما برح المُفتون یختلفون
فیحلل ھٰذا ویحرم ھٰذا فلا یعیب ھٰذا علی ھٰذا[1]۔ یعنی علما اہل وسعت ہیں۔ اور مُفتی ہمیشہ
باہم اختلاف کرتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ایک چیز کو حلال تبلاتا ہی دوسرا اُسی کو
حرام کہتا ہی۔ مگر یہ اُس کی عیب گیری نہیں کرتا اور وہ اِس کی۔ اس مقولے میں جہاں تک کہ
میری فہم ناقص میں آیا ہی ویحرم ھٰذا تک اختلاف کی حد ہی اُس کے بعد جَدَل و خصومت کا
بیان ہی۔ قول ہذا میں تین پہلو دکھلائے گئے ہیں۔ سب سے اول گروہ علما کی یہ صفت بیان

[1] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۱۲۴۔

کی ہو کہ اُن کے خیالات وسیع ہوتے ہیں۔ اُس کے بعد یہ بتلایا ہو کہ اُن میں باہم اختلاف ہوتا رہا۔ اور پھر یہ جتایا ہو کہ ان کا اختلاف باوجود اپنی سنگینی کے عیب گیری کی حد تک نہیں پہنچتا میں اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ جو اختلاف کشادہ دلی کے ساتھ بے شائبۂ عیب گیری ہو وہ سلف صالحین کا طریقہ ہو اور اسی کو رحمت فرمایا ہو۔ اور جو بحث تنگ دلی اور عیب گیری کے پیرائے میں ہو وہ خصومت ہو اور اسی سے بچنے کی تاکید ائمہ ہدیٰ نے فرمائی ہو۔ آج کل مسلمانوں میں جو مباحثے ہو رہے ہیں اُن کو اسی معیار کے بموجب پرکھنا چاہیے اور جس قسم میں وہ داخل ہوں اُسی کے احکام اُنپر جاری کیے جائیں۔ جزئیات مسائل کا اختلاف صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے رسالہ انصاف میں یہ اختلاف اور اس کے اسباب کسی قدر بسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں ہم اُس کی چند مثالیں جو طبقات الحفاظ میں نظر پڑیں یہاں درج کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ آنحضرتؐ سے احادیث کم روایت کیجائیں بعض صحابیوں کا مسلک اس کے خلاف تھا۔ اسی اختلاف کی وجہ سے خلیفۂ ثانی نے تین جلیل القدر صحابہ حضرت ابن مسعود و ابوالدرداء اور ابو مسعود کو نظربند رکھا اور فرمایا کہ تم نے آنحضرت سے حدیثیں بہت روایت کر دیں[1]۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ خلیفۂ ثانی حضرت اُبیؓ کی بہت تکریم کرتے تھے اُنسے ضرورت کے وقت فتویٰ لیتے بلکہ اُن کی ہیبت مانتے۔ باوجود اس کے صحابی ممدوح کے ہمراہ ایک بار ایک جماعت دیکھکر ان کے مارنے کو دِرّہ اُٹھایا۔ حضرت اُبیؓ نے کہا دیکھو کیا کرتے ہو۔ خدا تم پر رحم کرے۔ امیر المومنین نے فرمایا کہ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ یہ جماعت سرگروہ کے لیے باعث فتنہ اور تابع کے واسطے موجب ذلت ہو[2]۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں حضرت ابو ذر کو فتویٰ

---

[1] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۷
[2] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۵ و ۷۔

دینے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد وہ کئی برس زندہ رہے اور ۳۲ھ میں بمقام ربذہ انتقال فرمایا۔ رضی اللہ عنہ۔ کیا اس بیان کی حاجت ہے کہ صحابۂ کرام میں ان جزئی اختلافات کے ساتھ اتفاق کیسا تھا۔ تابعین کے زمانے میں اختلافِ عقائد بھی شروع ہو گیا تھا۔ اور معتزلہ و قدریہ وغیرہ فرقے پیدا ہو گئے تھے۔ اُس عہد میں بہت سے اسلامیہ فرقے ایسے موجود ہو گئے تھے جن کا اب نام و نشان بھی نہیں اور صرف کتابوں میں ذکر رہ گیا ہے۔ اُس دورِ پاک میں مسلمانوں کے حوصلے بلند تھے اور جو کام وہ کرتے تھے اُس میں جوش و ہمت کا پورا جلوہ ہوتا تھا۔ اس لیے یہ تازہ وارد فرقے بھی اپنے عقائد کی اشاعت میں پوری کوشش و سعی سے کام لے رہے تھے۔ ہمارے علمائے کرام اِدھر تو ملّت حقہ کی حفاظت و حمایت میں جان لڑا رہے تھے۔ اُدھر انھیں مخالف العقیدہ علما کی مرتبہ دانی اور حق شناسی میں نہایت کشادہ دلی سے مصروف تھے اُن کے حالات پڑھ کر اس کشادہ دلی کی کوئی حد معلوم نہیں ہوتی تین قسم کے دلائل سے ہم اپنے اس دعوے کو ثابت کر سکتے ہیں۔ اوّلاً علمائے ممدوح نے اُنسے علم دین حاصل کیا اور اُن کو روایت حدیث کا اہل سمجھا۔ حضرت قتادہ کی جو جلالت شان حدیث میں ہے اُس سے کون واقف نہیں۔ بڑے بڑے ائمہ حدیث اُن کے شاگرد ہوئے ہیں۔ عقیدۃً وہ قدری[2] شدید تھے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ باوجود اُن کے اس عقیدۂ ردی کے کسی نے اُن کی روایت کو مستند ماننے میں پس و پیش نہیں کیا[1]۔ امام مغیرہ تابعی عثمانی تھے اور حضرت خلیفۂ چہارم پر گونہ معترض۔ تاہم شعبہ اور ابو عوانہ وغیرہ جلیل الشان اماموں نے اُن سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ امام احمد اُن کی نسبت فرماتے ہیں صاحب سنۃ

---

[1] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۱۲۔ [2] فرقہ قدریہ کا یہ عقیدہ ہے کہ بندہ اپنے افعال خیر و شر کا خالق و قادر ہے۔ ۱۲ الملل والنحل

[3] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۱۱۰۔

اور احمد عجلی نے اُن کے ثقہ ہونے کی شہادت دی ہی[1]۔ عمرو ابن مرہ تابعی کی نسبت بیان کیا گیا ہی کہ وہ مرجیہ[2] تھے۔ پھر بھی ایک جماعت نے اُن کی توثیق کی ہی[3]۔ ہشام دستوائی قدری تھے۔ امام ابن سعد اُن کے بارے میں فرماتے ہیں کہ کان ثقۃ حجۃ الا انہ یری القدر یعنی وہ ثقہ اور حجت تو تھے مگر قدری تھے[4]۔ سعید ابن عروبہ بھی فرقہ قدریہ میں سے تھے فن رجال کے دو مشہور وعالی درجہ اماموں نے اُن کے ثقہ ہونے کی شہادت دی ہی یعنی حضرت یحییٰ ابن معین اور امام نسائی نے[5]۔ حافظ ابو نعیم فرماتے ہیں کہ میں نے آٹھ سو شیوخ سے فن حدیث حاصل کیا مگر حسن ابن صالح سے افضل کسی کو نہیں پایا۔ اُن کے عقیدے کی نسبت امام ذہبی فرماتے ہیں کان فیہ خارجیۃ[6] یعنی اُن میں خارجیت تھی[7]۔ امام ابو سہل واسطی شیعی تھے۔ اور اسی جرم میں خلیفہ ہارون الرشید نے اُن کو قید کر دیا تھا۔ امام ذہبی اُن کے احوال میں تحریر کرتے ہیں متفق علی الاحتجاج بہ یعنی اُن کے حجت ہونے پر سب کو اتفاق ہی[8]۔ محمد ابن فضیل کوفی بھی شیعی تھے۔ حضرت یحییٰ ابن معین نے اُن کی توثیق فرمائی ہی۔ اور امام احمد اُن کی نسبت فرماتے ہیں حسن الحدیث شیعی[9]۔ حافظ حدیث ابو معمر قدری تھے۔ اس پر بھی امام بخاری نے اُن سے حدیث روایت کی ہی[10]۔ عبد اللہ ابن موسیٰ فرقہ شیعہ کے علمائے کبار میں تھے اُن سے بھی امام بخاری نے روایت فرمائی ہی[11]۔ ابن الاخرم امام شعرانی کے بارے میں فرماتے ہیں صدوق غالٍ فی التشیع یعنی سچے ہیں اور تشیع میں غالی[12]۔ شیخ الاسلام انصاری ایک جلیل القدر امام حدیث کی نسبت اپنی رائے جن الفاظ میں ظاہر فرماتے ہیں وہ قابل شنید ہیں۔ ثقۃ

---

[1] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۲۸ [2] فرقہ مرجیہ کا یہ عقیدہ تھا کہ ایمان کی حالت میں کوئی معصیت مضر نہیں جیسے کفر میں طاعت مفید نہیں ۱۲ الملل والنحل۔ [3] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۰۸۔ [4] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۴۸ [5] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۶۰ [6] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۹۵۔ [7] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۳۸ [8] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۸۸ [9] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۷۷ [10] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۲۴ [11] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۰۲

فی الحدیث رافضی خبیث[1] یعنی حدیث میں ثقہ رافضی خبیث ہیں۔ حضرت یحییٰ ابن معین اس مرحلے کو انتہا تک پہنچاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ لوارتد عبد الرزاق ما ترکنا حدیثہ یعنی اگر عبد الرزاق مرتد بھی ہو جائیں تو بھی ہم اُن کی روایت کردہ حدیث کو چھوڑینگے[2]۔ ان اقوال وافعال کو آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ علمائے مخالف العقیدہ خواہ قدری تھے خواہ خارجی مرجیہ تھے یا شیعہ۔ کبار علمائے شیعہ میں سے تھے۔ یا۔ شیعہ غالی ورافضی خبیث مگر جب اُن کو ہمارے علمائے کرام نے ثقہ۔ حجت۔ صدوق۔ صاحب سُنت اور افضل پایا تو اُن کو ایسا ہی کہا اور ایسا ہی مانا اور اُن کی روایت کی ہوئی حدیثوں کو آنکھوں سے لگایا اور دل میں رکھا ہم تو حیرت میں ہیں کہ ایک شخص کو رافضی خبیث کہیں اور پھر ثقہ بتائیں۔ یہ ضدیں کیونکر جمع ہوئیں۔ اور دوسرے شخص کو یہ فرض کرنے کے بعد بھی کہ وہ مرتد ہو جائے اس کی روایت کردہ احادیث کے ترک کرنے کو گوارا نفرمائیں۔ یہ مشرق و مغرب کا اجتماع کیسا۔ سچ یہ ہی کہ یہ معما چودہویں صدی میں حل ہونا بیحد دشوار ہی اس کے حل کرنے والے وہی بزرگ تھے۔ جن کی قوت ایمانی نے اُن کے قلوب کو تعصب سے پاک اور حق کا شیدا بنا دیا تھا۔ ثانیاً اُن کے فضل و کمال کی یہ تعظیم کی کہ حضرت عکرمہ (جن کا عقیدہ خوارج کی جانب مائل تھا) جب بصرے تشریف لیجاتے ہیں تو حضرت خواجہ حسن بصری فتوی دینے اور درس تفسیر سے دست کشیدہ ہو جاتے اور جب تک اُن کا وہاں قیام رہتا خواجہ صاحب اسی برتاؤ کو قائم رکھتے[3]۔ ثالثاً علوم ظاہر سے گزر کر اُن کی روحانی عظمت کا اعتراف کیا۔ امام ابراہیم ابن طہمان (جنہوں نے امام اعظم سے سماعت حدیث کی تھی) عقیدے کے مرجیہ شدید تھے۔ ایک دن کا ذکر ہی کہ امام احمد ابن حنبل بوجہ ضعف علالت تکیے کے سہارے سے بیٹھے تھے۔ اس اثنا میں کسی نے ابن طہمان

---

[1] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۲۴۷ [2] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۱۴۳ [3] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۸۴

کا تذکرہ چھیڑا۔ امام ربانی یہ سنتے ہی سنبھلکر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ جس مجلس میں صلحا کا ذکر ہو اسمیں تکیہ لگا کر بیٹھنا روا نہیں[۵۱]۔ خداوند ایسے پاک مشرب بزرگ اب کیوں نہیں پیدا ہوتے۔ منصور ابن زاذان جلیل القدر تابعی تھے۔ امام ذہبی نے اُن کا ذکر ان الفاظ سے کیا ہی۔ کان ثقة۔ حجة۔ صالحا کبیر الشان جب حضرت خواجہ حسن بصری نے رحلت فرمائی تو تابعی ممدوح نے علی ابن زید سے (جو شیعہ تھے) فرمایا کہ تم حسن کی جگہ بیٹھو[۵۲]۔ اس موقع پر اگر بغور سے دیکھا جاے کہ حضرت حسن بصری کی جگہ کیا جگہ تھی تو اس واقعے کی قوت انتہا کو پہنچتی ہی۔ اس بحث میں اب صرف ایک امر فیصلہ طلب باقی ہی۔ وہ یہ کہ آیا ان فرقوں میں عقیدے کی سختی اور شدت اُس عہد میں اسی حالت میں تھی جیسی آج ہی یا بجاے سختی کے اعتدال تھا۔ ضمنی طور پر اوپر کے بعض جرحوں کے الفاظ سے سختی کا پتہ لگتا ہی۔ لیکن ہم واقعات کی مدد سے بالتصریح ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ شیعیت میں جو سخت سے سخت بدعت ہی وہ شتم صحابہ ہی۔ معاذ اللہ من ذلك دوسری صدی ہجری میں یہ ناسزا طریقہ اس فرقے میں رائج ہو گیا تھا اور عوام میں نہیں بلکہ خواص میں۔ چنانچہ لکھا ہی کہ شیخ حدیث ابو الاحوص کا مکان جب محدثین سے بھر جاتا تو وہ اپنے بیٹے سے فرماتے کہ دیکھو ان میں جو شتم صحابہ کرتا ہو اُس کو نکال دو (وفات ابو الاحوص ۱۷۹ھ[۵۳]) اسی عہد میں قدریت بھی سنگین پیرایہ اختیار کر چکی تھی۔ امام ابو اسحٰق فزاری جب دمشق میں آئے تو ابو المسہر سے فرمایا کہ کہدو کہ جو قدری ہو ہماری محفل سے چلا جائے (وفات ابو اسحٰق ۱۸۵ھ[۵۴])۔ ان دونوں واقعوں سے معترضین کچھ نفع نہیں اُٹھا سکتے۔ اس لیے کہ جن بزرگوں کے اقوال وحالات سے ہم نے استدلال کیا ہی اُن کے مقابلے میں امام ابو الاحوص وابو اسحٰق کی راے فروغ نہیں پا سکتی۔

---

[۵۱] تذ۔ ج ا صفحہ ۱۹۲ [۵۲] تذ۔ ج ا صفحہ ۱۲۶ [۵۳] تذ۔ ج ا صفحہ ۲۲۰ [۵۴] تذ۔ ج ا صفحہ ۲۴۸۔

اختلاف عقائد کی صورت میں جب ہمارے علما نے اپنے مخالفین سے حُسن سلوک پیشِ نظر رکھا تو ظاہر ہے کہ اختلافِ جزئیاتِ مسائل اُن کے مزاجوں پر کب مؤثر ہو سکتا تھا اور اس لیے اس قسم کی مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر ہم تذکرۃً چند حالات گزارش کرتے ہیں۔ آج کل خود اہل سنت وجماعت کے مختلف فرقے باہم ایسا ہی اختلاف اور شدت کا برتاؤ کر رہے ہیں جیسا کہ وہ خلاف اہل سُنت فرقوں کے ساتھ رکھتے ہیں۔ پس یہ چند مثالیں بھی خالی از نفع نہ ہوں گی۔ امام قدوری حنفی اور شیخ ابوحامد اسفرائنی شافعی کے مابین ہمیشہ مناظرہ رہتا تھا۔ مگر شیخ شافعی کا فضل وکمال امام حنفی کی نظروں میں سمایا ہوا تھا اور اس لیے وہ اُن کی نہایت تعظیم کرتے تھے[1]۔ فقیہ عماد الدین شافعی اور قاضی القضاۃ ابوطالب زینبی حنفی آپس میں سخت مخالف تھے۔ شافعی فقیہ کو پیامِ اجل قاضی القضاۃ سے پہلے آگیا۔ چونکہ ابوطالب کا ایک مخالف دنیا سے کم ہو گیا۔ اس لیے اُن کو بظاہر خوشی کا موقع تھا۔ لیکن جب زینبی اُن کے دفن سے فارغ ہوئے۔ تو اُن کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر یہ حسرتناک شعر پڑھا

عقم النساء فلا تلدن شبیهه ان النساء بمثله عقم

خواجہ حسن بصری اور امام ابن سیرین میں باہم کسی وجہ سے بدمزگی ہو گئی تھی۔ اسی بے لطفی کے سبب سے امام ابن سیرین خواجہ صاحب کے جنازے کے ساتھ تشریف نہیں لے گئے[2]۔ ایک دن کسی شخص نے آکر اُن سے بیان کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک جانور مسجد کا سب سے زیادہ خوشنما سنگریزہ اُٹھا لے گیا۔ ابن سیرین نے فرمایا کہ تیرا یہ خواب سچا ہے تو حسن بصری کی وفات قریب ہے چنانچہ چند ہی روز کے بعد اُس سرگروہ اصفیا نے وفات پائی[3]۔ اس واقعے سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ باوجود اُس قدر کشیدگی کے امام ابن سیرین نے خانۂ خدا کا

[1] ابن۔ ج ا صفحہ ۲۰ [2] ابن۔ ج ا صفحہ ۳۲۸ [3] ابن۔ ج ا۔ صفحہ ۱۲۹۔

نفیس سنگریزہ خواجہ صاحب ہی کو بتایا۔اس بحث میں ہم ایک پُر مذاق قصہ نقل کرتے ہیں۔
خفش امام نحو اور ابن رومی شاعر مشہور کے مابین چشمک ہوگئی تھی۔ابن رومی بہت ضعیف الاعتقاد تھا۔اور بدشگونی سے بہت ڈرتا تھا۔خفش کبھی کبھی اُس کے دروازے پر علی الصباح پہنچتا اور کچھ نحس کلمے کہہ کر چلا آتا۔ابن رومی پر اسکا اس قدر اثر پڑا کہ اُس روز وہم کے مارے دن بھر گھر سے باہر نہ نکلتا۔جب تنگ آگیا تو اُس نے بھی اپنا حربہ سنبھالا اور خفش کی ہجو کہنی شروع کردی ؏ کہ شاعر جو برنجد بگو ید ہجا۔خفش جو کلام فصیح پر شیدا تھا اپنی ہجو کے اشعار کو اُنکی خوبی اور روانی کی وجہ سے حفظ کرلیتا۔اور مجالس املا میں جہاں اور استادوں کے شعر سند میں پیش کرتا وہاں اشعار بالا کو بھی موقع موقع سے سُناتا جاتا اور فخریہ کہتا کہ چلو ابن رومی نے اس گمنام کو یاد تو کیا۔اگرچہ ہجو کے ساتھ ہی سہی۔بگڑے دل شاعر نے جو یہ قصہ سُنا تو جلکر ہجو کہنی بھی چھوڑ دی[لے]۔

حیف کہ یہ بہشتی زمانہ بہت دنوں تک مسلمانوں میں قائم رہ کر آخر آنجہانی ہوگیا اور نزاعوں کے دروازے امت مرحومہ کے علما پر کھُل گئے۔پھر کیا تھا۔قدری وجبری تو ایک طرف رہے خود اہل سُنت وجماعت کے ناجی فرقوں میں وہ وہ جھگڑے ہوئے کہ کشت وخون تک نوبت پہنچی۔بہت سے پیشوایان ملت نے خود سُنّیوں کے ہاتوں سے ایسی ایسی اذیتیں برداشت کیں جن کو سُنکر دل کانپ اُٹھتا ہی۔امام زاہد شیخ الاسلام انصاری نے جو حنبلی تھے حنفیہ اور شافعیہ علما کے ہاتوں کیا کیا مصیبتیں نہیں اُٹھائیں۔پانچ مرتبہ ننگی تلوار اُن کی گردن پر رکھی گئی وطن چھوڑ کر بلخ جانا پڑا۔سلطان الپ ارسلاں جب ہرات پہنچا۔تو مشائخ شہر ایک بہانے سے شیخ الاسلام کے خلوت خانے میں گئے اور اُن کے سجادے کے نیچے ایک تانبے کی مورت

لے ابن۔جلد ۱۔صفحہ ۳۳۲۔

رکھدی اور سلطان سے مخبری کی کہ ابو اسمٰعیل مجسمیہ فرقے کے پیرو ہیں اور اُنھوں نے اپنی محراب میں ایک بت رکھ چھوڑا ہی[1]۔ طرفہ ماجرا یہ ہی کہ شیخ الاسلام وہ بزرگ عالی درجہ ہیں جنکی شان وعظمت کا اہل ظاہر و باطن دونوں نے اعتراف کیا ہی۔ حافظ کبیر ابو نعیم صاحب حلیہ جن کا نام آج تک ادب کے ساتھ لیا جاتا ہی اُن کی ایک زمانے میں یہ حالت تھی کہ مذہبی مخالفت کی وجہ سے لوگوں نے اُن سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ اُس زمانے میں حنبلیوں و اشاعرہ میں اس قدر تعصب بھڑکا ہوا تھا کہ روز فتنہ و فساد برپا رہتا تھا۔ ایک دن جب حافظ ابو بکر ابن علی کی مجلس املا ختم ہو گئی تو ایک شخص نے کہیں یہ کہدیا کہ جب کو ابو نعیم کی مجلس درس میں چلنا ہو وہ اُٹھے۔ یہ کہنا تھا کہ اُس بیچارے کی شامت آگئی۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور سارے اصحاب حدیث قلم تراش لے لیکر اُس مصیبت زدہ پر دوڑ پڑے۔ قریب تھا کہ وہ اُسی موقع پر قتل ہو جائے۔ خدا خدا کر کے اُس کی جان بچی[2]۔ ہم اُنھیں دو مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور اس سے زائد یہ قابل تاسف قصے بیان کرنا نہیں چاہتے۔ حیف یہ ہی کہ جب کبھی جو کچھ کیا گیا ہمیشہ اُس کا نام نصرت دین اور حمایت ملت ہی رکھا گیا۔ اگر ہم اس باب کے اوّل و آخر واقعات کو ملائیں تو صاف یہ نتیجہ نکلتا ہی کہ اتفاق و اختلاف کے لیے مذہب و عقائد کے ماوری بھی بہت سے اسباب ہیں۔ عنوان ہذا کو ہم ذیل کی نتیجہ خیز حکایت پر ختم کرتے ہیں۔ نحو کا امام یزیدی ایک وزا امام ادب خلیل بصری سے ملنے گیا۔ خلیل اس وقت ایک وسادہ (گدّے) پر متمکن تھے۔ یزیدی کو آتا دیکھکر ایک طرف کو ہو بیٹھے اور وسادے کا ایک حصہ خالی کر دیا۔ یزیدی نے بیٹھکر کہا کہ میں خیال کرتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ تکلیف سے بیٹھے ہیں۔ یہ سُنکر اُس ادیب بے نظیر نے یہ لاجواب جواب دیا ماضاق موضعٌ

---

[1] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۳۷۶ و ۳۷۹ [2] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۲۹۳ و ۲۹۴

علی اثنین متحابّین والدنیا لا تسع اثنین متباغضین یعنی دو دوستوں کے لیے کوئی جگہ تنگ نہیں اور دو دشمنوں کے لیے سارے جہان میں بھی وسعت نہیں[1]۔

[1] ابن۔ ج ۴۔ صفحہ ۳۳۰

عنوانِ چہارم

حُسنِ معاش

علمائے سلف کی طالب علمی۔ حق پسندی۔ اور حالات اتفاق و اختلاف سے ہم بحث کرچکے۔ اور جیسی کچھ بحث کی گئی آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ ایک نہایت ضروری پہلو پر ہنوز بحث باقی ہی۔ وہ یہ کہ ہمارے علمانے دنیا میں کس طرح بسر کی اور اپنی معاش کو کس طور پر حاصل کیا اُن کے صفات کی تکمیل ایک حد تک اس موضوع پر منحصر ہے۔ دنیا اور اُس کے معاملات اگر لغو ہوتے تو پانچوں وقت کی نمازیں دین کی بھلائی سے پہلے دنیا کی بھلائی کی دُعا نہ مانگی جاتی۔ اور فقہ کی کتابوں میں صرف عبادات کے ابواب ہوتے معاملات کے پیچیدہ مسائل کا ذکر نہوتا۔ عُلما جب دنیا میں رہے اور دنیا کے تعلقات اُنھوں نے پیدا کیے۔ کسی انسان کے محکوم بنے کسی کے حاکم مختلف مشرب و خیال کے آدمیوں سے مِل جُل کر اس عالم میں رہے تو فطرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ اُنھوں نے ان تعلقات کو کیسا نباہا۔ آیا سلیقے اور خوبی سے سب کے حقوق ادا کیے یا اُن کو تسامح اور بے پروائی کے نذر کرکے اُس کا دل خوش کن نام استغنا رکھا۔ ایمہ مجتہدین نے جو موشگافیاں مسائلِ معاملات میں کی ہیں اور جو آسان راہیں کاروبار کے متعلق نکالی ہیں وہ اس امر کی زبردست شہادت ہیں کہ وہ اعلیٰ درجے کے معاملہ فہم اور معاملاتِ دنیا پر غور فرمانے والے تھے۔ اس عنوان میں سب سے اوّل ہم یہ دیکھینگے کہ علمائے سلف نے اپنی معاش کن ذرائع سے پیدا کی اُس کے بعد یہ بحث

کریں گے کہ اُن کے تعلقات ملوک و رعایا کے ساتھ کیسے رہے۔ آخر میں اُن کے مختلف حالات ایسے لکھیں گے جن سے کسی نہ کسی پہلو سے اُن کی طرز معاشرت پر روشنی پڑے گی۔

کسب معاش

تجارت

تجارت مسلمانوں کا مقدس پیشہ ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ سارے مسلمانوں میں افضل صحابہ کرام تھے۔ اور صحابہ میں مہاجرین کو فضیلت تھی۔ اور مہاجرین میں قریش کا مرتبہ بڑھا ہوا تھا۔ قریش کا خاص پیشہ تجارت تھا جس کا ذکر کلام پاک میں جابجا موجود ہے علمائے سلف میں جن بزرگوں نے معاش قوت بازو سے حاصل کی اُن کا رجحان خاطر اکثر تجارت کی طرف رہا ہے۔ چنانچہ ہم ذیل میں ایک جدول کے ذریعے سے اُن علما کے نام نامی مع اُس مال کے جس کی وہ تجارت فرماتے تھے عرض کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوگا کہ کیسے کیسے بڑے علمائے اُمّت نے تجارت کے وسیلے سے کسب معاش فرمایا تھا۔

نمبر	اسمائے علما	مال تجارت	کیفیت
۱	حضرت سالم ابن عبداللہ	۔	بازار میں لین دین کیا کرتے تھے (تذ۔ جلد ا صفحہ ۷۷)
۲	ابو صالح سمّان	روغن زیتون و روغن زرد	(تذ۔ جلد ا صفحہ ۷۸)
۳	امام یونس ابن عبید	ریشمی پارچہ	(تذ۔ جلد ا۔ صفحہ ۱۳۰)
۴	داؤد ابن ابی ہند	ریشمی پارچہ	(تذ۔ جلد ا۔ صفحہ ۱۳۱)
۵	امام ابو حنیفہ	ریشمی پارچہ	امام ممدوح کی صدر دکان کوفے میں تھی اور انکے ایجنٹ جابجا ملک میں پھیلے ہوئے تھے جو مال خرید کر صدر کو بھیجتے تھے (تذ۔ جلد ص ۱۵)
۶	حضرت عبداللہ ابن مبارک	۔	امام ذہبی انکا ذکر یوں شروع کرتے ہیں الامام التاجر السفار دوسرے موقع پر فرماتے ہیں افنیٰ عمرہ حاجًّا و تاجرًا۔ (تذ۔ جلد ا صفحہ ۲۵)

نمبر	اسمائے عُلما	مال تجارت	کیفیت
۷	وثیمہ	پارچہ ریشمی	(ابن۔جلد۲صفحہ۱۷۱)
۸	حافظ الحدیث غندر بصری	چادر اور سوتی پارچہ	(تذ۔جلد۱۔صفحہ۲۷۵)
۹	عبدالرزاق حمیری	•	امام ذہبی فرماتے ہیں رحل تجارۃ الی الشام۔ تذ۔جلد۱ص۳۴۳
۱۰	امام القرا حمزہ زیات	زیتون و پنیر اور اخروٹ	کوفے سے روغن زیتون حلوان کو لیجاتے وہاں سے پنیر اور اخروٹ لاکر کوفے میں بیچتے۔ (ابن۔جلد۱صفحہ۱۶۷)
۱۱	حافظ الحدیث فضل کوفی	•	(تذ۔جلد۱۔صفحہ۳۴۱)
۱۲	حسن بن ربیع کوفی استاد امام بخاری	بوریے	اسی تجارت کی وجہ سے اُنکا لقب بوریاری ہے۔ تذ۔جلد۲صفحہ۴۴
۱۳	امام ابوالحسن نیشاپوری	•	(تذ۔جلد۳۔صفحہ۱۰۱)
۱۴	ہشام دستوائی	پارچہ	دستوا اہواز (عراق عرب) کا ایک قصبہ تھا وہاں سے کپڑا لاکر فروخت فرماتے تھے اسی لیے دستوائی لقب پڑ گیا۔ تذ۔جلد۱صفحہ۱۴۷
۱۵	احمد ابن خالد قرطبی	جُبّہ فروش	(تذ۔جلد۳۔صفحہ۳۶)
۱۶	امام ابن جوزی	تانبا	انکے گھرانے میں تانبے کی تجارت ہوتی تھی۔ آپ کبھی کبھی اپنے نام کے آگے صفار (ٹھٹیرا) لکھدیتے (تذ۔جلد۴صفحہ۱۳۷)
۱۷	حافظ الحدیث ابن رومیہ	ادویہ	اسی تجارت کے سبب سے اُنکا لقب عشاب ہوگیا تھا علم نباتات میں اپنے زمانے میں بےنظیر تھے۔ تذ۔جلد۴۔صفحہ۲۱۷
۱۸	ابو یعقوب لغوی	چوبی لٹھا	(ابن۔ج۱۔صفحہ۳۱۵)
۱۹	محمد ابن سلیمان	گھوڑے	(تذ۔ج۳۔صفحہ۱۰۸)

حرفت جن علماے سلف نے اپنی معاش حرفت کے ذریعے سے حاصل کی اور اُن کے

نام ہمکو معلوم ہوسکے اُن کے نام اور کام نیچے کے نقشے میں درج کیئے جاتے ہیں۔

نمبر	اسماے علما	نام حرفت	کیفیت
۱	ابوالفضل مہندس دمشقی طبیب مشہور	نجاری	اس فن میں وہ بہت ماہر تھے اور کثرت سے کام اُن کے پاس آتا۔ بیمارستان کبیر شاہی شفاخانہ کے اکثر دروازے اُن کے ہات کے بنے تھے۔ جامع مسجد دمشق کی گھڑیاں (ساعات) اُنھوں نے درست کی تھیں۔ اور اُن کی نگرانی کے متعلق اُنکو تنخواہ ملتی تھی۔ عیون۔ جلد۲ صفحہ ۱۹۱
۲	ابن طاہر۔	کتابت	صحیحین اور ابوداؤد سات سات بار اور سنن ابن ماجہ دس بار اُجرت پر لکھی۔ تذ۔ جلد۴۔ صفحہ ۴
۳	امام ابوالولید باجی	تار دبکنا	تذ۔ جلد۳۔ صفحہ ۱۷ ۳
۴	ابوسعید نحوی	کتابت	دس ورق روزانہ لکھتے تھے۔ یہ کام کرکے عدالت قضا میں اجلاس کرتے۔ انھیں اوراق کی اُجرت پر بسر اوقات تھی۔ نزہت صفحہ ۳۸۱۔
۵	ابن الہیثم طبیب نامور	کتابت	تین کتابیں سال بھر میں لکھتے۔ مجسطی متوسطات اور اقلیدس۔ ان کی قیمت ڈیڑہ سو اشرفی لیتے اور انھیں دیہوں پر بسر کرتے۔ عیون۔ جلد۲ صفحہ ۹۱
۶	امام ابن الخاضبہ	کتابت	(تذ۔ جلد۴ صفحہ ۲۴)

ملازمت

ملازمت اس لحاظ سے کہ وہ انسانی آزادگی پر ایک ٹکس اور بھاری ٹکس لگانے والی ہی اُن مزاجوں کو راس نہیں جو سارے عالم کے بکھیڑوں سے ایک علم کی خاطر آزاد اور بے تعلق رہنا پسند کرتے ہیں۔ اور اس وجہ سے ابتداءً ہم کو اس سے مایوسی تھی کہ ہم اس حصّہ عنوان ہذا کو معمور کر سکیں گے۔ مگر واقعات نے ہماری مایوسی کو بدگمانی ثابت کیا اور حالات نے بتلایا کہ علمائے سلف نے علمی شان کو قائم رکھ کر اعلیٰ سے اعلیٰ دنیاوی عہدے حاصل کیئے اور اُن کے فرائض قابل ستایش طریقے سے انجام دیے ہیں۔ ہم ذیل میں چند اُن علما کے اسم گرامی درج کرتے ہیں جو عہدۂ جلیلہ وزارت تک ترقی کر کے پہنچے۔ اس سے قیاس ہو سکتا ہی کہ اس سے کم درجے کے عہدے بھی اُن کی ذات سے ممتاز رہے ہوں گے۔

نمبر	اسمائے علما	کس بادشاہ کے وزیر رہے	کیفیت
۱	امام ابوالفضل ابن خزابہ بغدادی	ملک کافور والی مصر	امام دارقطنی نے اُنسے روایت کی ہی۔ اور حافظ شارح اُنکی نسبت فرماتے ہیں کان من الحفاظ الثقاۃ۔ وبرویٰ فی حالۃ الوزارۃ (تذ۔ جلد ۳۔ صفحہ ۲۲۶ و ۲۲۷)
۲	قاضی علامہ ابن نظیر		(تذ۔ جلد ۳۔ صفحہ ۲۶۳)
۳	امام ابن حزم	خلیفہ مستظہر باللہ	(تذ۔ جلد ۳۔ صفحہ ۳۲۴)
۴	امام لغت ونحو افلیلی	مکتفی باللہ خلیفہ اندلس	(ابن۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۲)
۵	کمال الدین فقیہ شافعی	نورالدین زنگی والی شام ومصر	قاضی ابن خلکان اُن کی نسبت کہتے ہیں کان عظیم الریاسۃ خبیرا بتدبیر الملک (ابن۔ جلد ا صفحہ ۴۷۲)
۶	مولانا تاج الدین براہیم پاشا رئیس الوزراء	سلطان بایزید یلدرم	(شق۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۳۱)

تلاش سے اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں مگر نمونے کے لیے اسی قدر شاید کافی ہوں گی کم درجے کی ملازمتیں اختیار کرنے سے بھی علما کو احتراز نہیں رہا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ قبیصہ خلیفہ عبدالملک کے مُہردار تھے[1]۔ امام اسمعیل جو امام اوزاعی کے اُستاد ہیں خلیفہ منصور کے توشہ خانے (خزانۃ الثیاب) کے داروغہ[2] اسی سلسلے میں ہم کچھ نظیریں اُن علما کی پیش کرنا چاہتے ہیں جو وقتاً فوقتاً ایک دربار کی جانب سے دوسرے دربار کو بطور سفیر تشریف لے گئے۔ سب سے زیادہ قابلِ غور امام شعبی اور شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی کی مثالیں ہیں۔ اول الذکر میں یہ امر لائق لحاظ ہے کہ جس دربار کو سفارت لے گئے وہ غیر مسلم دربار تھا۔ اور دوسرے میں وہ تفرد و تجرید قابل ملاحظہ ہے جو سرگروہ سلسلۂ سہروردیہ کو دنیاوی تعلقات اور علائق سے تھی۔ یہ مثالیں بین ثبوت اس امر کا ہیں کہ علماے کرام کو ہر حال میں مسلمانوں کے مصالح دینی کے ساتھ دُنیاوی مصلحتوں پر نظر رہی ہے۔ اور دونوں کو اُنھوں نے قابل توجہ خیال فرمایا ہے۔

نمبر	اسماے علما	کس دربار کی جانب سے سفیر ہوئے	کس دربار میں گئے	کیفیت
۱	امام شعبی	خلیفہ عبدالملک اُموی	قیصر روم	قیصر کے دل پر انکی دانشمندی کا بہت اثر ہوا اور اُسنے خلیفہ کو لکھا کہ مجھے تعجب ہے کہ ایسے شخص کے ہوتے مسلمانوں نے کیوں دوسرے شخص کو خلیفہ بنایا جب واپس آنے پر خلیفہ نے یہ فقرہ امام شعبی کو سُنایا تو آپنے کہا اور کیا خوب کہا کہ قیصر نے مجکو تو دیکھا مگر آپکو نہیں دیکھا۔ آپکو دیکھ لیتا تو ایسا نہ لکھتا۔ تذکرہ صفحہ
۲	شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی	دیوان عزیز یعنی دربار بغداد	دربار اربل	ابن۔ جلد ۱۔ صفحہ ۴۵۱

[1] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۷۲ [2] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۳۰۔

۳	حافظ ابن ماکولا	دیوان عزیز	طغاخان والی سمرقند		تذ۔ جلد ۴ صفحہ ۵
	امام ابوالمحاسن قریشی	دیوان عزیز	نورالدین زنگی	اس وقت انکی عمر تیس برس کی تھی۔	تذ۔ جلد ۴ صفحہ ۱۵۸
	امام ابویعقوب شیرازی	دیوان عزیز	متعدد دربار		تذ۔ جلد ۴ صفحہ ۱۵
	محمد ابن سلامہ قضاعی	دربار مصر	دربار روم	حمیدی نے انسے روایت کی ہے۔	ابن۔ جلد ۱ صفحہ ۴۶۲
	کمال الدین فقیہ شافعی	خلیفہ مقتفی باللہ	قلیج ارسلان والی روم		ابن۔ جلد ۱ صفحہ ۴۷۲
	علامہ قوشجی شارح تجرید	مرزا الغ بیگ والی سمرقند	سلطان محمد خاں فاتح	ان دونوں سلطنتوں میں نزاع تھا اسی لیے یہ بھیجے گئے تھے انکی حسن سعی سے صلح ہوگئی۔	شق۔ جلد ۱ صفحہ ۱۷۷

تمول

اہل کمال کے لیے مالدار ہونا اُن کی خوبی میں داخل نہیں اور نہ اس کے عدم یا وجود سے اُن کی عظمت کم یا زیادہ ہوسکتی ہے۔ باایںہمہ متمول ہونا اور با کمال ہونا یہ دونوں صفتیں باہم منافی بھی نہیں۔ حالات خاص نے اسکا مخالف پہلو ذہنوں میں راسخ کر دیا ہے۔ اور اس پہلو کے ذہن نشین ہونے سے بجاے نفع کے قوم کو نقصان پہنچا ہے۔ ہم اس غلطی کو رفع کرنے کے لیے مختصر سے واقعات ایسے عرض کرنے کے درپے ہیں جو علماے دین اور ائمہ مذہب کے تمول کا ثبوت دیں ان میں سے بعض واقعات یہ بھی دکھلائیں گے کہ جو دولت سرمایۂ غفلت تصور کی گئی ہے وہی نیک اور لائق ہاتوں میں پہنچکر کیسی خیر و برکت کا باعث ہوسکتی ہے۔

امام لیث مصری کی سالانہ آمدنی اسی ہزار اشرفیاں تھیں (آٹھ لاکھ روپے) مگر کبھی اُن پر زکوۃ واجب نہیں ہوئی (اس لیے کہ سال گزرنے سے پہلے کل آمدنی نیک کاموں میں صرف کردیتے تھے[1]۔ امام دعلج بغدادی جو دارقطنی کے استاد ہیں اُن کی سرکار سے مکۂ مکرمہ

---

[1] الرحمۃ الغیثیہ صفحہ ۶ –

عراق اور سجستان کے علماے حدیث کے وظائف مقرر تھے۔ مکہ مکرمہ میں ایک مکان جسکا نام دار العباس تھا اُنھوں نے تیس ہزار اشرفی کو خریدا تھا۔ جب اُنھوں نے وفات پائی تو معز الدولہ نے تین لاکھ اشرفیاں اُن کے ترکے میں سے لے لیں[۱]۔ امام ابو الہیثم کی نسبت لکھا ہو کہ بہت مالدار تھے۔ تین یا چار دفعہ اُنھوں نے اپنے ہموزن چاندی خیرات کی تھی[۲]۔ حافظ ابن العربی کے تمول اور فیاضی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہو کہ اشبیلیہ (واقع اندلس) کی شہرپناہ اُنھوں نے اپنی جیب خاص سے تعمیر کرائی تھی[۳]۔ حافظ رئیس ابن ابی ذہل ہروی کی سالانہ آمدنی اتنی تھی کہ عشر کی بابت ایک ہزار خروار غلے کی سال بہ سال اُن کی سرکار میں آتی تھیں۔ امام ذہبی اُن کی نسبت فرماتے ہیں کان کثیر الاموال[۴]۔ قاضی عیاض صاحبِ مشارق الانوار کو اپنے عہد میں اس قدر رِفعت اور ریاست حاصل تھی کہ کبھی کسی کو اُن کے شہر میں نصیب نہیں ہوئی۔ امام موصوف فرماتے ہیں کہ جس قدر اُن کی رِفعت بڑھی اُسی قدر اُن کی تواضع اور خوف الٰہی میں ترقی ہوتی گئی[۵]۔ شیخ ابو حامد اسفرائنی کی نسبت ابن خلکان اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں انتهت اليه رياسة الدنيا والدين ببغداد[۶]۔

علما کے تعلقات سلاطین کے ساتھ اور اُن کا اثر سلاطین پر

انقلاب زمانہ نے جو تہ بتہ پردے علماے سلف کے حالات پر ڈالے ہیں اُنھوں نے اُن کی بہت سی اعلیٰ اور مفید صفتیں نظروں سے چھپا دی ہیں جب اُن کے صفات کی اصلی تصویریں چھپ گئیں تو ذہنوں میں اُن کے غلط نقشے کھنچے اور جیسے وہ نہ تھے ویسے ماننے گئے۔ اور جب ان غلط نقشوں کی پیروی کی گئی تو قدم راہ صواب سے

---

[۱] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۹۸ [۲] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۲۳۶ [۳] تذ۔ ج ۴ صفحہ ۹۱ [۴] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۲۱۳

[۵] تذ۔ ج ۴ صفحہ ۱۰۰ [۶] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۱۹۔

دُور جا پڑے۔ اور مقصود فوت ہو گیا۔ علماے کرام کی نسبت گویا یہ مسلّمہ مسئلہ ہی کہ انکو سلطنت
وسلاطین سے کوئی تعلق نہیں اور نہ یہ تعلق اُن کے لیے زیبا ہی۔ اسی خیال کا یہ اثر ہی کہ ہم صدیوں
سے عُلما اور سلاطین کو باہم محض ناآشنا اور بیگانہ پاتے ہیں۔ جن دقیق نگاہوں نے سوسیٹی
کے حالات اور اُس کے باہمی تعلقات کی پوری پوری چھان بین کی ہی اُنھوں نے پتا لگایا
ہی کہ مختلف تمدنی گروہ کسی نہ کسی قانونی سلسلے میں ضرور جکڑے ہوے ہیں اور اپنی اپنی
متناسب جگہ پر کسی نہ کسی اُصول کے مطابق قائم ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہی کہ اگر ان
سلسلوں میں سے کوئی سلسلہ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو نظامِ قومی درہم برہم ہو جائے گا
کوئی شبہہ نہیں کہ جب عُلما کا قدم سلسلہ انتظام سے نکل گیا تو جو کام اس عظیم الشان سلسلے
میں اُن کے کرنے کے تھے وہ ابتر ہو گئے۔ اور اس طرح حکومت و خلافت کی وہ ہیئت کذائی
قائم نہ رہی جو اسلام نے کھینچی تھی۔ ہم نے جس تعلق کی نفی اوپر کی ہی اُس سے ہماری مراد
وظیفہ خواری یا صلہ بخشی کا تعلق نہیں ہی بلکہ وہ تعلق مراد ہی جو ایک رُکن انتظام کو اُس کے
سرگروہ کے ساتھ ہوتا ہی۔ ہماری اس تمہید کو جو حضرات ملاحظہ فرمائیں وہ علما کا مفہوم ذرا
عالی ذہن میں قرار دیں ورنہ ہمارے الفاظ بھٹی سے زیادہ رتبہ حاصل نہ کریں گے۔ یہ امر ظاہر
ہی کہ ہر منصب اور مرتبہ خاص خاص صفات چاہتا ہی اور جبتک انسان وہ صفات نہ پیدا کرے
اُس منصب کے لائق نہیں ہو سکتا۔ جن عُلما کے سلسلہ انتظام سے خارج ہو جانے کی وجہ
سے ہم نے سلسلہ حکومت کو ابتر قرار دیا ہی وہ عُلما وہ تھے جو مدبرانہ دل و دماغ رکھتے تھے
اور معاملے کو معاملے کے پہلو سے سمجھنے والے تھے نہ کسی اور پہلو سے۔ ہم جو واقعات
اس سلسلے میں پیش کریں گے وہ شاید اس بات کے ثابت کرنے میں قاصر نہ رہیں کہ عُلما
نے جو سلطنتوں اور سلاطین سے تعلق رکھا تو وہ تعلق عامۂ مسلمین اور خود سلطنت کے حق میں کیسا

مفید ہوا۔ اور کیسی دینی اور دنیاوی برکتیں اُن سے مسلمانوں کو پہنچیں۔ جو تعلق ایسا فائدہ مند اور نافع تھا وہ حقارت اور نفرت سے دیکھے جانے کے لائق نہ تھا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بہت سے عُلماے کرام وقتاً فوقتاً یا ہمیشہ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے ایسے تعلقات کو عار بلکہ مضر تصور فرمایا ہی مگر ساتھ ہی اُس کے ہجری صدیوں کے اوائل میں کچھ نہ کچھ عُلمائے کرام ہمیشہ ایسے بھی موجود ہوتے تھے جو ان تعلقات کو اختیار فرماتے تھے اور اس طرح دینی و دنیاوی سلسلوں میں سد سکندری قائم نہیں ہونے پاتی تھی۔ امام اعظم نے عہدۂ قضا قبول نہیں فرمایا اور اس سختی سے انکار فرماتے رہے کہ دِرّے کھائے قید بھگتی انھیں کے شاگرد رشید امام ابو یوسفؒ سارے قاضیوں کے سرگروہ بنے اور ہارون الرشید کی مشہور خلافت کی خوبیوں میں ایک خوبی اُن کی ذات سے پیدا ہوئی۔ ع وللناس فیما یعشقون مذاہبُ

حضرت عمر ابن عبد العزیز جن کی خلافت خلافت راشدہ مانی گئی ہی اور جن کے عہد حکومت نے عالم کو عدل و انصاف سے مالا مال کر دیا تھا۔ اگر ایک امام تابعی کا قدم درمیان میں نہوتا تو بظاہر اسباب دُنیا اُن کی حکومت کی نعمت سے محروم رہتی۔ اور از سرِ نو عالم میں اسلامی تازہ روح نہ پھُکتی۔ جب سلیمان ابن عبد الملک خلیفہ دمشق کو شدت مرض نے مایوسی کے انداز دکھلائے اور رحلت کے قرب کی پیشین گوئی کی تو اُس کو اپنے جانشین کے تعین کی فکر ہوئی۔ ایک کاغذ پر اُسنے ولیعہد کا نام لکھا اور مشورے کے لیے امام رجاء[1] ابن حیات کے سامنے پیش کیا۔ امام ممدوح نے جو اُس کو پڑھا تو اُس میں خلیفہ کے ایک

---

[1] تابعین کے چوتھے طبقے میں فن حدیث کے امام ہیں۔ مکحول نے اُن کو سید اہل شام بتایا ہی اور بعض نے شامیوں میں سب سے زیادہ نقیہ اُن کو مانا ہی۔ ۱۲ (تذ- ج ۱- صفحہ ۱۰۵)

نابالغ بیٹے کا نام درج پایا۔ یہ دیکھ کر اُنھوں نے سلیمان سے فرمایا کہ خلیفہ کو اگر قبر میں آسودگی مطلوب ہی تو اپنا جانشین مرد لائق مقرر کرنا چاہیے۔ خلیفہ کے دل میں اُن کا یہ کلام چُبھا اور اُس نے کہا کہ میں مکرر غور کرلوں۔ ایک یا دو دن کے توقف کے بعد اُس نے وہ کاغذ چاک کرڈالا اور امام ابن حیات کو بلا کر پوچھا کہ میرے بیٹے داؤد کی نسبت تمھاری کیا رائے ہی امام نے فرمایا کہ وہ قسطنطنیہ کی مہم پر یہاں سے صدہا میل دُور ہی اور نہ معلوم اس وقت زندہ بھی یا نہیں۔ خلیفہ تو پھر میں کس کو ولیعہد مقرر کرلوں۔ امام۔ جو امیرالمومنین کی رائے میں اس منصب کے قابل ہو۔ خلیفہ۔ عمر ابن عبدالعزیز کی نسبت تمہارا کیا خیال ہی۔ امام۔ میرے خیال میں وہ نیک۔ فاضل اور سلیم الطبع ہیں۔ خلیفہ۔ تمھاری رائے دُرست ہی۔ وہ ایسے ہی ہیں اور میں انھیں کو ولیعہد کروں گا۔ یہ کہکر سند ولیعہدی حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے لیے لکھی اور اُس کو سربمُہر کردیا۔ اس کے بعد کوتوال شہر کو طلب کرکے حکم دیا کہ خاندان خلافت کے کُل ارکان حاضر کیے جائیں۔ جب سب حاضر ہولیے تو امام رجا رنے حسب ایماے خلیفہ اُس سربمُہر کاغذ پر سب سے بیعت لی۔ اور بعد بیعت اُن کو رخصت کردیا اس عہدنامے کی تکمیل کے بعد اجل نے سلیمان کو زیادہ مہلت نہیں دی اور چند ہی ساعت کے بعد اُسکو مُلک ومال سے جُدا کردیا۔ امام ابن حیات نے ایک معتمد ایوان خلافت کے دروازے پر بٹھا دیا کہ کسی کو اندر نہ جانے دے اور اس طرح وفات کی خبر کو شائع ہونے سے روکدیا اس انتظام سے فارغ ہوکر اُنھوں نے کوتوال کے ذریعے سے پھر اہل بیت خلافت کو بُلایا اور دوبارہ اُس سربمُہر فرمان پر بیعت لی۔ جب بیعت ہوچکی اور اُنھوں نے سمجھ لیا کہ اب کُل کارروائی مستحکم ہی تو فرمایا کہ خلیفہ نے وفات پائی۔ اور یہ کہکر کاغذ کھول کر سُنایا۔ جب ہشام ابن عبدالملک نے (جو دعویدار خلافت تھا) حضرت عمر ابن عبدالعزیز کا نام سُنا تو

سے کہنے لگا کہ قسم ہے رب کی ہم کبھی ان کی بیعت نہیں کر سکتے۔ امام رجا نے کہا کہ بہتر ہے کہ کھڑے ہو اور آکر بیعت کرو ورنہ تلوار سے تمہارا ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ ہشام کو موقعے کا رنگ دیکھکر چارناچار بیعت کرنی پڑی۔ ہشام کی بیعت کے بعد امام رجا نے حضرت عمر ابن عبدالعزیز کا بازو پکڑا اور منبر پر بٹھا دیا۔ منبر پر پہنچتے ہی اُن کی خلافت کا عملی دَور شروع ہو گیا۔ اس واقعے سے امام رجا ابن حیات کی قوت فیصلہ حُسن تدبیر اور استقلال طبیعت جیسا کچھ ظاہر ہوتا ہے۔ الفاظ خود بتا رہے ہیں ہمارے جتانے کی کچھ حاجت نہیں[۱]۔ امام ابو یوسف کا جو اقتدار خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں رہا اُس سے ایک عالم واقف ہے۔ ابن خلکان اُن کی نسبت لکھتے ہیں کہ ابو یوسف علم وحکمت اور ریاست و اقتدار میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ اُن کے زمانے میں اُن سے بڑھ کر کوئی دربار میں نہ تھا[۲]۔ یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ مذہب حنفی کی اشاعت میں امام ابو یوسف کے اقتدار نے غیر معمولی قوت پیدا کر دی تھی۔ امام یحییٰ ابن یحییٰ مصمودی جو حضرت امام مالک کے شاگرد رشید اور موطّا کے ناقل ہیں ملک اندلس کے اُمرا و سلاطین کے یہاں بہت محترم تھے اسی اقتدار کے اثر سے امام مالک کا مذہب مُلک اُندلس میں پھیلا[۳]۔ ایک اور امام وقت حضرت یحییٰ ابن اکثم دربار مامونی میں اول درجے کے ذی اثر رکن تھے۔ ابن خلکان اُن کی نسبت یہ الفاظ لکھتے ہیں۔ اُن کے علم فضل۔ ریاست اور سیاست اور اُس تعلق سے جو اُن کو خلفا اور سلاطین کے ساتھ رہا زمانہ واقف ہے۔ مامون الرشید کے مزاج پر وہ اسقدر حاوی تھے کہ کسی کی وقعت اُن سے زیادہ خلیفہ کے دل میں نہ تھی۔ چونکہ خلیفہ کو علوم میں کمال تھا اس لیے اُس نے ان کے علم وعقل کے مرتبے کو کماحقہ سمجھا تھا۔ عہدۂ قاضی القضاتی پر وہ ممتاز تھے۔ تدبیر مملکت میں اُن کو اسقدر مداخلت حاصل تھی

---

[۱] کامل ابن اثیر ج ۵ صفحہ ۱۲۶ [۲] ابن۔ ج ۲ صفحہ ۳۰۴ [۳] ابن۔ ج ۲ صفحہ ۲۱۶۔

کہ وزرا کے احکام اُن کی راے لیلنے کے بعد نافذ ہوتے تھے[1]۔ سلطان شہاب الدین غوری کی (جس کا نام تاریخ ہندوستان میں آج تک روشن ہی) مدد آغازِ کار میں امام فخر الدین رازی نے اپنے مال و دولت سے فرمائی تھی جب وہ بڑھ کر سُلطان ہوگیا تو یہ اُس کے دربار میں گئے اور شہاب الدین نہایت احترام کے ساتھ پیش آیا۔ اسی طرح امام ممدوح دربار خوارزم میں موقر اور محترم تھے[2]۔ امام زہری خلیفہ عبدالملک اور ہشام کے متقربین میں تھے[3]۔ اور خطیب بغدادی عزالدولہ کے مقربوں میں داخل تھے[4]۔ مولانا قونیوی کی نسبت لکھا ہی کہ سلطان روم کے حضور میں اُن کو نہایت ہی قدر و تمکین حاصل تھی اور نو برس تک وہ اسی شان سے مقبول بارگاہ سلطانی رہے[5]۔ امام غزالی نے جب امیر المسلمین یوسف ابن تاشقین کی تعریف سُنی تو اُس سے ملنے کے لیے افریقہ کو روانہ ہوئے۔ امام ممدوح ہنوز منزل مقصود تک نہ پہونچے تھے کہ امیر موصوف کو اجل نے عالم آخرت میں پہنچا دیا۔ یہ خبر امام غزالی نے اسکندریہ میں سُنی اور وہیں سے واپس چلے آئے[6]۔

ابن رافع قشیری حافظ حدیث اپنے مکان پر حدیث شریف پڑھایا کرتے تھے اور طلبہ کے علاوہ خراسان کے امیر نامور طاہر کی اولاد بھی مع خَدَم و حَشَم حاضر درس ہوتی۔ شیخ کے جلال کا یہ عالم ہوتا تھا کہ کسی کو بات کرنے یا مسکرانے کی تاب و مجال نہ ہوتی[7]۔ ملک عادل سلطان صلاح الدین کا بھائی بڑے دبدبے اور سطوت کا فرماں روا گزرا ہی۔ ایک مرتبہ محدث اسلام عبدالغنی دمشقی اُس سے ملنے گئے تھے۔ ملک عادل کا بیان ہی کہ جس وقت حافظ عبدالغنی میرے سامنے آئے تو مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ ایک شیر آگیا[8]۔ امیر تیمور نے ایک روز

---

[1] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۱۷ [2] ابن۔ جلد ۱۔ صفحہ ۴۷۵ [3] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۴۵۱ [4] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۳۳۴۔

[5] العقد المنظوم صفحہ ۳۶۹ [6] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۳۷۰ [7] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۹۳ [8] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۱۶۹۔

اپنا ایک قاصد کسی ضروری کام پر روانہ کیا۔ اور اُس کو یہ عام اجازت دی کہ ضرورت کیوقت جس کا گھوڑا ملجائے اُس پر سوار ہولے۔ قاصد کو چلتے چلتے ایک جگہ سواری کی حاجت ہوئی اتفاقاً اسی موقع پر علامہ تفتازانی مصنف مطول خیمہ زن تھے۔ اور خیمے کی ٹیگاہ میں اُن کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے برید وہاں گیا اور جاتے ہی بے دھڑک ایک گھوڑا کھول لیا۔ علامہ ممدوح اُس وقت اپنے خیمے کے اندر تھے۔ اس قصے کی اطلاع ہوئی تو نہایت برہم ہوئے اور قاصد سلطانی کو پکڑا کر نکلوا دیا۔ وہ جب لوٹ کر دربار میں پہنچا تو علامہ کی شکایت پیش کی امیر تیمور کا جو حال یہ ماجرا سُن کر ہوا ہوگا آسانی سے قیاس میں آسکتا ہے۔ ہیجان غضب کے سبب سے تھوڑی دیر ساکت رہا اُس کے بعد کہا کہ اگر شاہرخ یہ حرکت کرتا تو بیشک سزا پاتا مگر میں ایسے شخص کا کچھ نہیں کرسکتا جس کا قلم ہر شہر و دیار کو میری تلوار سے پیشتر فتح کرچکا تھا۔[1]
عمرو صفار والی خراسان امام خفاف سے کہا کرتا تھا کہ چچا اگر میں کوئی کام آپ کی مرضی کے خلاف کروں تو آپ میری گردن اڑا دیں[2]۔ سلاطین عثمانیہ میں سلطان سلیم خاں بڑے جلال اور ہیبت کا بادشاہ ہوا ہی۔ ایک موقع پر اُس کو ملازمان خزانہ پر غصہ آگیا اور اُن میں سے ڈیڑہ سو آدمیوں کے قتل کا حکم دیدیا۔ مولانا علاء الدین جمالی ان دنوں قسطنطینہ میں مفتی تھے اُنھوں نے جو یہ سخت حکم سُنا تو اُن بیکس ملازموں پر رحم آیا اور سلطان کو سمجھانے کے لیے باب عالی کو تشریف لے گئے۔ قاعدہ یہ تھا کہ مفتی صدر بیدون کسی حادثہ عظیم کے باب عالی کا قصد نہیں کرتا تھا۔ جب یہ ایوان وزرا میں داخل ہوئے تو سارے اہل دیوان حیران رہ گئے کہ خدا خیر کرے مفتی صاحب کیسے تشریف لائے۔ حضور سلطانی میں ان کی اطلاع ہوئی اور یہ اجازت ملی کہ تنہا آئیں۔ یہ وہاں پہنچے اور سلام کرکے بیٹھ گئے۔ بیٹھنے کے بعد سلسلہ تقریر یوں

---

[1] شق۔ ج ا۔ صفحہ ۹۵ [2] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۲۸۔

شروع کیا۔ جو علما منصب فتویٰ رکھتے ہیں اُن کا فرض ہے کہ سلطان وقت کی آخرت درست رکھنے کی فکر رکھیں۔ میں نے سُنا ہے کہ سلطان نے ڈیڑھ سو آدمیوں کے قتل کا حکم دیا ہے حالانکہ شرعاً یہ تجویز ناجائز ہے لہذا میں عفو سلطانی کی استدعا کرتا ہوں۔ سلطان کو اپنے مفتی کی یہ مداخلت نہایت شاق اور ناگوار معلوم ہوئی اور قہر آلود ہو کر کہا کہ تمکو اپنی حد اختیار سے بڑھنا اور امور سلطنت میں دخل دینا نہیں چاہیے۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ میں معاملات سلطنت میں دخل نہیں دیتا بلکہ عاقبت سلطانی کی عافیت چاہتا ہوں اور میرا یہ فرض ہے۔ ان عفوت فلك النجاة[۵۱] و الا فلك عقاب عظیم سلطان کے دل پر اس کلام کی جلالت اثر کر گئی اور غصہ فرو ہو گیا۔ اور اُن تمام ملازموں کی خطائیں معاف کر دیں جب مفتی ممدوح نے اُٹھنے کا قصد کیا تو فرمایا کہ میں سلطان کی آخرت کے متعلق تو فرض منصبی ادا کر چکا اب ایک بات شان سلطنت کی نسبت کہنا چاہتا ہوں۔ سلطان نے پوچھا وہ کیا تو اُنھوں نے جواب دیا کہ یہ سب بیچارے آپ کے غلام ہیں کیا یہ مناسب ہوگا کہ غلام شاہی ہو کر دربدر مانگتے پھریں۔ سلطان نے فرمایا کہ نہیں۔ اُنھوں نے کہا تو ان کی جگہ پھر اُنھیں کو عطا فرمائی جائے۔ سلطان نے ازراہ مراحم خسروانہ اس کو بھی قبول کیا مگر یہ کہا کہ ان کو قصور کی سزا ضرور دیجائیگی۔ مولٰنا نے فرمایا کہ اس میں مجھ کو کچھ کلام نہیں ہے کیونکہ تعزیری سزا رائے سلطانی پر منحصر ہے۔ اتنا کہکر سلام کیا اور گھر کو چلے آئے[۵۲]

ملک پر اثر اس بیان میں شاید کسی تمہید کی حاجت نہیں ہے۔ علما کی جو عظمت ہمیشہ مسلمانوں کے دل میں رہی ہے اُس کے کچھ نہ کچھ آثار اب بھی پائے جاتے ہیں علماے سلف کو جو مقبولیت عامۂ خلق میں حاصل رہی ہے اور عموماً اہل ملک نے جس محبت

[۵۱] اگر تم معاف کر دو گے تو نجات پاؤ گے ورنہ سخت عذاب میں مبتلا ہو گے

[۵۲] شق۔ ج ۱ صفحہ ۳۲۴۔

اورادب کی نظر سے اُن کو دیکھا ہے اُس کی کیفیت پڑھ کر ایک قسم کا تحیّر پیدا ہوتا ہے۔ اگر صرف اُن کے ہم مسلک اور ہم مذہب اُن کی توقیر کرتے اور ان پر قربان ہوتے تو ہم یہ سمجھتے کہ مذہبی خیالات کا کرشمہ تھا جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مخالف فرقے اور یہود و نصاریٰ اُن کی تعظیم و محبّت میں ایسے ہی سرگرم اور محو تھے جیسے خود اُن کے ہم مشرب تو ہم کو یہ باور کرنا پڑتا ہے کہ محض مذہبی خیالات نہیں بلکہ عُلما کے اخلاق و صفات اُن کی عظمت کے اہم اور اصلی اسباب تھے۔ اس میں بھی کوئی شبہہ نہیں کہ اس مقبولیت کو اُس فیاضیِ خیال اور وسعت نظر سے بہت ترقی ہوتی تھی جو عموماً ہم علماے سلف میں پاتے ہیں۔ اور یہ اُن کی فیاضی کسی طبقے اور فرقے کے ساتھ مخصوص نہیں تھی بلکہ عموماً بندگان خدا کے واسطے عام اور شامل تھی۔

ایک مرتبہ خلیفہ ہارون الرشید مع لشکر شہر رقہ میں خیمہ زن تھا۔ اتفاقاً اسی موقع پر حضرت عبداللہ ابن مبارک امام حدیث کا گزر شہر مذکور میں ہوا۔ اُن کے استقبال کے لیے لوگوں کا یہ ہجوم ہوا کہ سارے اُفق پر غبار چھا گیا اور کشمکش میں آدمیوں کی جوتیاں پارہ پارہ ہوگئیں۔ حرم سرائے خلافت کے چوبی برج سے خلیفہ کی ایک کنیز نے جو یہ ہنگامہ دیکھا تو حیرت زدہ ہوکر پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ کسی نے کہا کہ خراسان کے عالم ابن مبارک تشریف لائے ہیں اُن کے لینے کے لیے مخلوق کا ہجوم ہو رہا ہے۔ شوخ مزاج کنیز نے بیساختہ کہا کہ واللہ حکومت اس کو کہتے ہیں۔ ہارون کی کیا حکومت ہے جس کے لیے لوگ اہلکاروں کے زور اور دباؤ سے جمع ہوتے ہیں[1]۔ امام بخاری جب دربار علم سے کمال کا خلعت پہنکر اپنے وطن بخارا کو آئے تو بخاریوں نے نہایت جوش کے ساتھ اُن کے استقبال کا اہتمام کیا۔ شہر سے تین میل کے فاصلے پر خیمے ایستادہ کیے گئے اور تمام اہل بخارا اُن کی پیشوائی کے واسطے آئے یہاں تک کہ

[1] ابن۔ ج ا۔ صفحہ ۲۴۴

کوئی قابل ذکر آدمی باقی نہیں رہا۔ شہر میں اُن کو اس شان سے لائے کہ روپئے اور اشرفیاں سر پر سے نثار کیجاتی تھیں۔ ہمارے علوم کا دوسرا مرکز شہر نیشا پور بھی امام ممدوح کی تعظیم میں اپنے ہمسر بخارا سے پیچھے نہیں رہا۔ امام مسلم فرماتے ہیں کہ جب امام بخاری کے تشریف لانے کی خبر نیشا پوریوں نے سُنی تو بعض نے دو منزل اور بعض نے تین منزل آگے جاکر استقبال کیا۔ اور شہر میں جس شان سے وہ داخل ہوئے وہ شان میں نے کسی حاکم یا عالم کی آمد میں نہیں دیکھی[1]۔ امام فیروزی جب ایک دینی کام کے لیے شہر بغداد سے چلے تو ایک جم غفیر نے اُنکی مشایعت کا قصد کیا۔ اُنھوں نے ہر چند منع کیا لیکن جوش عقیدت میں کسی نے ممانعت کا لحاظ نہیں کیا۔ سامرّہ[2] پہنچکر جو ہمراہیوں کا اندازہ کیا گیا تو پچاس ہزار آدمی تخمینے میں آئے[3]۔ ایک مرتبہ شیخ ابو اسحق شیرازی خلیفۂ بغداد کی طرف سے ایک خدمت پر خراسان تشریف لے گئے تھے۔ جب وہ نیشا پور سے معاودت کرنے لگے تو پیشواے خراسان امام الحرمین نے سوار ہوتے وقت رکاب تھام لی۔ اس کا اثر تمام ملک خراسان میں یہ ہوا کہ شیخ ممدوح کے گھوڑے کے سموں کے نیچے کی مٹی بطور تبرک اُٹھائی اور آنکھوں سے لگائی گئی[4]۔ سفیان ابن عُیینہ جب کوفے میں تشریف لائے اور امام اعظم نے اُن کے آنے کی خبر سنی تو شاگردوں سے فرمایا کہ تمھارے شہر میں عمرو ابن دینار کے علم کا حافظ آیا ہی۔ اس مختصر جملے نے سارے اہل کوفے کے دل ابن عُیینہ کی جانب مائل کر دیئے اور لوگ جوق جوق ابن دینار کی احادیث سُننے کے لیے اُن کی خدمت میں آنے لگے۔ اُس وقت ابن عُیینہ کی عمر بیس برس سے کم تھی وہ فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص نے مجھ کو اول محدث بنایا وہ ابو حنیفہ ہیں[5]۔ علما کے ساتھ عامۂ خلائق کا یہ جوشِ عقیدت صرف اُن کی زندگی تک محدود نہ تھا اُنکے وفات فرما جانے کے

---

[1] مقدمہ صفحہ ۴۸۱ و ۴۹۰ [2] شہر بغداد کا ایک حصّہ [3] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۲۰۷ [4] ابن۔ ج ۲ صفحہ ۱۲۴ [5] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۲۱۱۔

بعد بھی قائم رہتا تھا۔ بلکہ بعد وفات اور زیادہ نمایاں ہوتا تھا۔ امام طاؤس تابعی کا جنازہ جب اُٹھایا گیا تو آدمیوں کا اسقدر ہجوم تھا کہ جنازہ کسی طرح نہ نکل سکا۔ آخر حاکم وقت نے فوج بھیجی اور اُس کے اہتمام سے جنازہ نکلا۔ خاندان نبوت کے چشم و چراغ حضرت عبداللہ ابن حسن (رضی اللہ عنہما) جنازے کو اٹھائے ہوے تھے۔ لوگوں کی کش مکش سے انکا لباس پارہ پارہ ہوگیا[1]۔ امام الحرمین نے جب وفات پائی تو تمام شہر نیشاپور کے بازار ماتم میں بند ہوگئے۔ اور جامع مسجد میں جس منبر پر امام ممدوح خطبہ پڑھا کرتے تھے وہ توڑ دیا گیا[2]۔ اسیطرح جب امام ابویعلی موصلی کا انتقال ہوا تو اکثر بازار شہر کے بند کر دیے گئے[3]۔ امام ابوجعفر طبری کی قبر پر کئی مہینے تک شب و روز نماز جنازہ پڑھی گئی[4]۔ امام ابن ابی داؤد کے جنازے کی نماز اسی دفعہ ادا ہوئی۔ کل نمازیوں کا تخمینہ کیا گیا تو تین لاکھ ہوا[5]۔

مخالف فرقوں کی محبّت ہمارے علما کے ساتھ

امام ابوالعلاے ہمدانی سے خوارزم کے لوگ جو عموماً معتزلی تھے نہایت محبت رکھتے تھے حالانکہ امام ممدوح کو اپنے مذہب حنبلی میں نہایت شدت تھی[6]۔ بغداد کے اہل سُنت و جماعت اور شیعہ میں ایک بار تنازع ہوا تو فریقین نے امام جوزی کو فیصلے کے لیے حَکم قرار دیا[7]۔ ایک زمانے میں دمشق کا حاکم جو شیعی تھا خطیب بغدادی سے برہم ہوگیا تھا اُس نے کوتوال شہر کو ایما کر دیا کہ خطیب کسی حیلے سے قتل کر دیے جائیں۔ امام ممدوح کو جب اس سازش کی خبر ہوئی تو اُنھوں نے شریف ابوالحسن کے مکان میں پناہ لی جب کوتوال نے اُن سے خطیب کو طلب کیا تو شریف موصوف نے فرمایا کہ خطیب کا قتل بالکل خلاف مصلحت ہے

[1] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۲۳۳ [2] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۸۸ [3] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۷۵ [4] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۲۸۲
[5] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۳۳۳ [6] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۱۲۰ [7] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۷۹

اگر وہ قتل کیے گئے تو یاد رکھو کہ عراق کے شیعوں کی ایک جماعت انکے ساتھ قتل ہوجائیگی[۱]۔

غیر مذہب کے لوگوں کی محبت علما کے ساتھ

عباد ابن عوام ناقل ہیں کہ جب امام منصور تابعی کا جنازہ اُٹھایا گیا تو میں حاضر تھا میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے علاوہ یہود اور نصاریٰ اپنے اپنے گروہ جُدا جُدا قائم کیے ہوئے جنازے کے ساتھ ساتھ تھے[۲]۔ امام ابوالعلا کبھی کبھی (ہمدان سے) اپنے وطن کو جمعہ پڑھنے جایا کرتے تھے۔ جب وہ تشریف لیجاتے تو اہل شہر اُن کی مشایعت کے لیے شہر سے باہر کھڑے ہوجاتے۔ ایک جماعت مسلمانوں کی ہوتی اور ایک گروہ یہودیوں کا۔ جب اُن کو دیکھتے تو دونوں فریق دعا دیتے تھے[۳]۔ ابوالفتح کمال الدین شافعی کے پاس یہود اور نصارا توراۃ اور انجیل پڑھنے آیا کرتے تھے۔ فقیہ ممدوح نے اُن کے ماننے والوں کی خاطر ان دونوں کتابوں کی شرح لکھی تھی[۴]۔ امین الدولہ ابن تلمیذ بغداد کے مشہور عیسائی طبیب کا مکان شہرہ روزگار مدرسۂ نظامیہ کے پڑوس میں تھا۔ جب کوئی طالب علم مدرسۂ مذکور کا بیمار ہوتا تو یہ نیک دل طبیب اُس کو اپنے مکان پر لے آتا۔ اُس کا علاج کرتا اور ہر قسم کی آسائش کی خبر رکھتا۔ اور بعد صحت پھر مدرسے میں پہنچا دیتا۔ طبیب موصوف کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب نفس اور شرافتِ خصلت میں وہ بے نظیر تھا۔ جب اُس نے وفات پائی تو (ابن خلکان کہتے ہیں) کہ شہر بغداد کے دونوں حصّوں میں کوئی قابل ذکر شخص ایسا نہ تھا جو اُس کے جنازے کے ساتھ گرجے میں نہ آیا ہو[۵]۔

---

[۱] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۳۳۷ [۲] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۲۷ [۳] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۱۲۰۔

[۴] ابن۔ ج ۲ صفحہ ۱۳۴ [۵] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۹۳۔

علما کی معاشرت کے متعلق بعض اور حالات

انکا لباس عرب کا ایک مشہور مقولہ ہے الناس باللباس علمائے کرام جو باطنی خوبیوں سے آراستہ تھے اُن کے حالات شاہد ہیں کہ ظاہری صفائی اور پاکیزگی کی جانب سے بھی اُن کو بے توجہی نہ تھی۔ سطرف بن عبداللہ پوشاک فاخرہ استعمال کرتے تھے[1]۔ امام دارالہجرت حضرت مالک لباس نہایت پاکیزہ اور قیمتی پہنتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں نے اپنے شہر (مدینہ طیبہ) کے جتنے فقہا دیکھے سب کو خوش پوشاک دیکھا۔ امام ممدوح جس مکان میں نشست فرماتے تھے وہ نہایت پاک صاف رہتا تھا۔ اُس میں چاروں طرف مسندیں بچھی رہتی تھیں اور ہر مسند پر جُدا جُدا پنکھے مہیا رہتے۔ اُن کی مجلس کا یہ داب تھا کہ کوئی بلند آواز سے بات نہ کرتا[2]۔ امام ابوحنیفہ بھی بہت خوش لباس تھے۔ حضرت عبداللہ ابن مبارک اُن کی نسبت فرماتے ہیں کان حسن[3] الوجہ حسن الثیاب ایک مرتبہ اُن کی ایک چادر کا تخمینہ کیا گیا تو تیس اشرفی ہوا۔ اور ایک دوسرے موقع پر ان کے پیراہن اور چادر کا اندازہ کیا گیا تو چار سو درہم ہوا۔ حماد اُن کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ میرے والد اس قدر خوشبو کا استعمال کرتے تھے کہ جب وہ کہیں جاتے تو لوگ خوشبو کی وجہ سے پہلے ہی سمجھ جاتے کہ امام اعظم آرہے ہیں[4]۔ شیخ الاسلام جعفی پاکیزہ لباس پہنتے[5]۔ شیخ الاسلام ہروی جن کا زہد مشہور ہے جب باہر تشریف لاتے تو لباس فاخرہ اُن کے جسم پر ہوتا اور بیش قیمت گھوڑا ران کے نیچے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ افعل ھذا اعزازاً للدین یعنی میں یہ اظہارِ حشمت دین کے معزز کرنے

---

[1] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۵۶ [2] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۹۱ [3] صورت اور لباس دونوں پاکیزہ تھے ۱۲

[4] خیرات حسان صفحہ ۲۲ و ۶۱۔ [5] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۲۔

کے واسطے کرتا ہوں[1]۔

جسمانی ریاضت ہم نے اس تحریر میں بعض عنوان ایسے قائم کیے ہیں جو نظر بحالات موجودہ علمائے کرام کے ذکر میں اجنبی بلکہ بے محل معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں میں سے غالباً یہ سُرخی بھی ہی۔ ہمارے قدیم مدارس میں جسمانی ریاضت کا منزلوں پتا نہیں ہی۔ مدارس جدیدہ تعلیم علوم کے برابر اس کو بھی مہتم بالشان خیال کرتے ہیں۔ ان دونوں حالتوں کے دو مختلف اثر پیدا ہوئے ہیں۔ نئی روشنی کے لوگ تو اس کو ترقی جدید کا ایک جلوہ سمجھ رہے ہیں۔ پُرانے فیشن کے بزرگ اس کو داخل لہو ولعب اور وثاقت ومتانت کے خلاف تصور فرما رہے ہیں تاریخی عدالت سے یہ فیصلہ ہوتا ہی کہ دونوں خیال واقعیت سے دُور ہیں۔ اہل علم میں جسمانی ریاضت کا اہتمام نہ تہذیب جدید کا نتیجہ ہی اور نہ خلاف متانت ووقار ہی۔ صدہا برس گزرے جب بھی ہمارے عُلما مردانہ ورزشوں کے پابند تھے اور جو لوگ پیشوائے اُمت مانے گئے ہیں اُنھوں نے اس کی طرف خاص توجہ فرمائی ہی۔ لہذا اس طریقے کو نہ جدید کہہ سکتے ہیں نہ خلاف شان عُلما۔ علما کے حالات ایک طرف۔ تیراندازی اور گھوڑے کی سواری کی مشق کی تاکید حضرت سرورِ کائنات نے فرمائی ہی۔ اور صحیح بخاری میں اُس گھوڑدوڑ کا ذکر ہی جس کا اہتمام آپ نے بنفس نفیس فرمایا تھا۔ اور جس میں عبداللہ ابن عمرؓ بھی ایک گھوڑے پر سوار تھے۔ اور اُس اونٹوں کی دوڑ کا مذکور ہی جس میں آنحضرت کی سواری کی اونٹنی دَوڑی تھی اس سے ثابت ہوتا ہی کہ جسمانی ریاضت ہمارے اہل علم کا خاص شعار ہونا چاہیئے۔ اس رسالے کی تحریر کے لیے جو کتابیں میں نے دیکھیں اُن سے ثابت ہوا کہ علمائے سلف کی عمریں عموماً بڑی ہوئی ہیں اور اخیر عمر تک اُن کے قُویٰ کام دیتے رہے ہیں۔ یہ حقیقۃً

---

[1] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۱۸۱ [2] علامہ عینی نے ہدایہ کی شرح بنایہ جب لکھی تو اُن کا سن نوّے برس سے تجاوز کرچکا تھا۔ کتاب مذکور کے خاتمے میں

اُسی ریاضت کا کرشمہ تھا جس کے وہ عادی تھے۔ ورنہ اس زمانے کی طرح ضعف دماغ اور جسمانی کمزوری اُس زمانے کے عُلما کی بھی خاص علامت قرار پاتی۔

امام ابن عون تابعی کے حالات میں لکھا ہی کہ اُن کو گھوڑے کی سواری کا شوق تھا۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے گورخر میدان میں گھیر کر مارا تھا[۵۱]۔ گورخر کی چالا کی مشہور ہی اُسکو میدان میں گھیرنا اور تلوار نیزہ یا تیر سے شکار کرنا بہت دشوار ہی۔ اس واقعے سے امام ممدوح کی اعلیٰ درجے کی شہسواری اور فنون شکار سے پوری واقفیت کا نشان ملتا ہی۔ امام شافعی رح نے تیراندازی میں وہ ملکہ حاصل کیا تھا کہ قریش میں اُنکا ثانی نہ تھا۔ اور یہ کمال بہم پہنچایا تھا کہ اُنکے دس تیر دس نشانے اُڑا دیتے تھے[۵۲]۔ امام بخاری کو بھی تیر اندازی کا خاص شوق تھا۔ اور اکثر گھوڑے پر سوار ہو کر شہر سے باہر اُس کی مشق کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ اُنکا ہات بھی ایسا سچّا ہو گیا تھا کہ کم تیر خطا جاتے[۵۳]۔ علامہ ابوالقاسم شافعی کی نسبت ابن خلکان لکھتے ہیں کان علامۃ فی الفقہ والتفسیر والحدیث والاصول والادب والشعر وعلم التصوف جمع بین الشریعۃ والحقیقۃ جو لوگ ابن خلکان کی پُراحتیاط روش تحریر سے واقف ہیں وہ میرے اس بیان کی تصدیق کریں گے کہ مؤرخ مذکور نے یہ الفاظ محض گرمی سخن اور آرائش بیان کے واسطے نہیں لکھے ہوں گے بلکہ واقعات نے یہ الفاظ اُن کے قلم سے لکھوائے ہونگے ہم کو اس موقع پر یہ بیان کرنا ہی کہ علامہ ممدوح کو اتنے علوم میں کمال پیدا کرنے کے ولولے میں بھی جسمانی ورزش اور فنون ریاضت کیطرف سے بے توجہی نہیں ہوئی۔ اور ان مشاغل عالیہ کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے گھوڑے کی سواری اور مردانہ فنون میں وہ مشق بہم

بقیہ صفحہ ۱۱۹۔ اُنھوں نے اس امر کی تشریح کی ہی اور فرمایا ہی کہ اس شرح کے لکھنے کا اتفاق اکثر شب کو ہوا ۱۲۔ [۵۱] تذ۔ ج ا صفحہ ۱۴۰۔

[۵۲] تذ۔ ج ا صفحہ ۳۳۱ [۵۳] مقدمہ صفحہ ۵۶۶۔

پہنچائی کہ اُن کی چابک سواری اور استعمال اسلحہ کی مہارت مرتبہ کمال کو پہنچی ہوئی تھی[1]۔

اپنا کام خود کرنا جو لوگ اپنا کام خود کرتے ہیں اُنکو اپنی ذات پر بھروسہ اور اعتماد ہوتا ہی اور اسی اعتماد نے دنیا میں بڑے بڑے کرشمے دکھلائے ہیں۔ جو لوگ اپنا کام خود نہیں کرتے اُنکے دل میں ایک قسم کی بزدلی پیدا ہوتی ہی اور یہ بزدلی انسانی حوصلے اور عزم کا بالکل ستیاناس کر دیتی ہی حضرت سرور کائنات کے حالات مبارک میں لکھا ہی کہ حضور اپنا کام خود دست مبارک سے فرمایا کرتے تھے۔ بکریوں کا دودھ آپ دوھ لیتے۔ پھٹا کپڑا خود سی لیتے۔ نعلین مبارک ٹوٹ جاتیں تو اُنکو اپنے ہی ہات سے گانٹھ لیتے غرض اپنے کام کے لیے دوسروں کو کم تکلیف دیتے۔ آپ کے خادم حضرت انس فرماتے ہیں کہ دس برس میں آپکی خدمت میں رہا اس عرصے میں میں نے آپکی خدمت اسقدر نہیں کی جتنے آپ نے میرے کام فرما دیئے۔ علماے سلف کے حالات شاہد ہیں کہ اُنھوں نے اپنے پیشواے لت (روحی فداہ) سے یہ سبق بھی حاصل کیا تھا اور جو قویٰ خداوند تعالےٰ نے ان کو عطا فرمائے تھے اُن کا پورا شکر بجا لاتے تھے۔ امام ابن طاہر جب فن حدیث کی تحصیل کے لیے امام حبال کی خدمت میں حاضر ہونے چلے تو لوگوں نے اُن کو جتا دیا کہ امام موصوف بازار سے اپنا کام خود کر لاتے ہیں وہاں بھی اُن کو تلاش کر لینا۔ چنانچہ جب یہ اُن کے شہر میں وارد ہوے تو اول بازاروں میں گشت لگایا۔ تلاش کرتے کرتے اُن کو امام حبال ایک عطار کی دکان پر اس ہیئت سے ملے کہ دامن میں وہ تمام ضرورت کی چیزیں بھری ہوئی تھیں جو بازار سے خرید کر لائے تھے۔ اس واقعے کی قدر اُس وقت بہت بڑھ جاتی ہی جب ہم دیکھتے ہیں کہ امام ممدوح کی عمر اُس زمانے میں اناسی برس کی تھی[2]۔ ابوالاسود دُوَلی واضع فن نحو پر اخیر عمر میں فالج گرا تھا اور اس کے اثر سے

---

[1] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۰۰ [2] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۳۸۵

اُن کے ہات پاؤں ماؤف ہوگئے تھے۔ اس معذوری کی حالت میں بھی وہ ہرروز پاؤں
گھسیٹتے ہوئے بازار کو جاتے اور اپنا کام کرلاتے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ضرورت انکو اس
تکلیف کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ کیونکہ ابوالاسود بہت آسودہ تھے اور بہت سے خادم اُن کی
سرکار میں حاضر رہتے۔ ایک روز کسی نے اُن سے ازراہ تعجب دریافت کیا کہ اس قدر خادموں
کے ہوتے ہوئے یہ شاقہ مصیبت ہر روز کیوں برداشت کیجاتی ہے۔ اُس ادیب نے بے مثل
جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ اس آمدوشد میں اتنا نفع ہے کہ جب میں گھر میں لوٹ کرآتا ہوں
تو لڑکے بھی کہتے ہیں کہ آ گئے لونڈیاں بھی کہتی ہیں کہ آ گئے۔ اگر گھر میں پاشکستہ ہوکر پڑا
رہوں تو بکریاں مجھپر پیشاب بھی کریں تو بھی کوئی خبر نہو؎۔ یہ مقولہ عجب حکمت انگیز ہے۔ اور
شخصی حالت سے لیکر قومی حالت تک یکساں موثر ہے۔ دنیا میں جو کچھ گرمی ہنگامہ ہے وہ سب
حرکت کا نتیجہ ہے اور سکون ملکوں اور قوموں کی رونق کو درہم برہم کرنے والا ہے۔ جو قومیں
ہات پاؤں چھوڑ بیٹھی ہیں وہ پامالی کے سوا اور کس چیز کی توقع اس عالم میں رکھتی ہیں۔
امام بخاری نے شہر بخارا کے باہر ایک مہمان سرا بنوائی تھی۔ اُس کی تعمیر کے وقت جو مزدور
معماروں کو اینٹیں پہنچاتے تھے اُن میں خود امام بخاری بھی شامل تھے۔ یہ امام ربانی اپنے
سر پر اینٹیں رکھکر لیجاتے اور راجوں کو دیتے۔ ایک شاگرد نے ازراہ دلسوزی ایک دن
عرض کی کہ آپ کو اس محنت کی کیا ضرورت ہے۔ امام ممدوح نے فرمایا کہ ھذا الذی ینفعنی؎
نفعنا اللہ تعالیٰ باتباع السلف الصالحین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

؎ ... صفحہ ۲۲۲ ؎ یہ وہ کام ہے جو مجھ کو نفع دیگا ؎ مقدمہ صفحہ ۶۲

... خان ... عبد الرحمن فرخ آبادی تلمیذ سابق ... خطاطان ... جناب ... احمد حسن صاحب ... بمطابقت ... لکھنوی ... محرم الحرام ۱۳۳۲ ہجری نبوی